مولانا ابوالکلام آزادؒ

اور

اُن کے معاصرین

مرتّبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا ابوالکلام آزادؒ

اور

اُن کے معاصرین

مرتّبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان کراچی

سلسلہ مطبوعات آزاد صدی ۱۵

کتاب :	مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین
مرتب :	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری
طابع :	المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ)
	مرار اسٹریٹ پاکستان چوک۔ کراچی ا
ناشر :	ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان ۔
	علی گڑھ کالونی ۔ کراچی اہم
قیمت	۵۰/- روپے

ملنے کا پتا

(۱)

مکتبہ شاہد

علی گڑھ کالونی ۔ کراچی اہم

(۲)

مکتبہ رشیدیہ

مرار اسٹریٹ ۔ پاکستان چوک

کراچی ۱

به تقریب

صد سالہ یوم پیدایش

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

وطن آبائی

دہلی مرحوم (پنڈت کا کوچہ)

سلامٌ علیٰ نجد، ومن حلّ بالنجد

وطن مادری، مدینہ طیبہ

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نما می خوانمش — رو سوئے ابرویش کند ہر چند می گردانمش

ولادتِ باسعادت

ذوالحجہ ۱۳۰۵ مطابق اگست ۱۸۸۸

بمقام مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً و کرامۃً، محلہ قدوہ، متصل باب السلام

بوادٍ غیرِ ذی زرعٍ عند بیتک المحرّم

وفاتِ حسرت آیات

۲ شعبان المعظم ۱۳۷۷ مطابق ۲۲ فروری ۱۹۵۸ بروز ہفتہ

بہ مقام دہلی (دارالحکومت ہند)

آزاد نیشنل کمیٹی، پاکستان

فہرست

پیش لفظ

"مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصر" کے عنوان سے جو مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے، اس میں شامل مضامین کا کوئی ایک انداز اور ایک اسلوب نہیں ہے۔ یہ مضامین نہ صرف مختلف اہل قلم کے ہیں بلکہ ہر صاحبِ قلم کا نقطۂ نظر بھی دوسرے سے جدا ہے اور مختلف حالات اور بدلے ہوئے گرد و پیش میں لکھے گئے ہیں۔ کہیں ذاتی تعلقات زیر بحث آئے ہیں، کہیں خصائص سیرت کا موازنہ کیا گیا ہے، کہیں افکار کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، اور کہیں ایک دوسرے کے اعترافات کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ایسی مثال بھی موجود ہے جہاں ذہنی فاصلوں کو ناپنے کی کوشش کی گئی ہے۔

معاصر شخصیات بھی اپنے فضائل و محاسن علمی اور خصائصِ فکر و سیرت میں ایک دوسرے سے جدا دائرہ رکھتی ہیں۔

ان میں بعض کے علم و عمل کے دائرے اتنے مختلف ہیں اور بعض کا ذوق و فکر اتنا متباین ہے کہ علم و عمل کے دائرے میں ان کی ہم فکری، ہم مشربی، علاقۂ محبت و وداد یا فکر و رائے کا اختلاف و کشمکش یا کسی لحاظ سے معاصرانہ چشمک کا مسئلہ زیر بحث نہ لانا چاہیے ___ لیکن وہ چوں کہ ایک ہی عہد میں تھے اور تہذیب و روایات، وضع داری، ادب و تاریخ یا مذہب و سیاست کے ذوق، فکر و نظر اور علم و عمل کے کسی اور دائرے میں اتحاد و اتفاق یا انکار و ایراد کا تعلق موجود تھا، اس لیے ان کے وجود گرامی کو نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا ___ علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، نواب صدر یار جنگ، سر عبدالقادر، مولوی عبدالحق، وحشت کلکتوی، مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا عبیداللہ سندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تعلق مولانا کے معاصرین کے اسی دائرے سے ہے۔

اس مجموعے کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ادب، مذہب، سیاست، صحافت اور علم و دانش اور فکر و عمل کے مختلف دائروں میں اپنی معاصر شخصیات میں مولانا آزاد ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ ضروری نہیں کہ کسی صاحبِ قلم نے مولانا آزاد کی کسی فضیلتِ علم و عمل کے بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے، اُسے بے چون وچرا تسلیم کر لیا جائے، یہ مقصد بھی نہیں کہ تمام قاری، اصحابِ قلم کے تمام افکار سے متفق ہو جائیں۔ مقصود تو مولانا ابوالکلام، ان کے عہد اور معاصر شخصیات کے بارے میں مطالعہ ونظر کا ایک باب کھولنا اور غور وفکر کی دعوت دینا ہے۔ معاصر شخصیات کے حوالے سے کسی شخصیت کا مطالعہ — اس کی فکر و سیرت کی تفہیم کا ایک اہم اور موثر ذریعہ ہے۔

یہاں مولانا آزاد اور ان کی معاصر شخصیات کو ہر صاحبِ قلم نے اپنے انداز سے اور صرف مقالے کے محدود دائرے میں اپنے مطالعے اور فکر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے اگر کسی شخصیت کا کوئی خاص پہلو بحث میں تشنہ رہ گیا ہو یا کسی وصف کی جستجو میں اس کی نظر نے کوتاہی کی ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ہر مقالے کو ایک خاص حد تک ہی وسعت دی جا سکتی تھی۔ بعض شخصیات اپنی فکر اور خدمات کے لحاظ سے اتنی ہمہ گیر ہیں کہ ان کا مطالعہ یوں بھی کسی ایک مقالے کا نہیں کتاب کا موضوع ہے۔ ایسے مقام پر جہاں کسی صاحبِ قلم کو پوری بات کہنے کی فرصت یا گنجایش نہ ہو، غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور کسی شخصیت کے معتقد کی ارادت کو ٹھیس بھی پہنچ سکتی ہے، لیکن بعض مضامین تشنگی کا احساس تو پیدا کر سکتے ہیں، کسی کی ارادت کو ٹھیس نہیں پہنچاتے۔

معاصر شخصیات کے اس مطالعے میں ادب، صحافت، مذہب، سیاست وغیرہ کے دائروں کی کئی شخصیات شامل نہیں ہیں۔ ان کے مطالعے کے لیے کسی دوسرے مجموعے کا انتظار کرنا چاہیے۔

ابوسلمان شاہجہان پوری

پشاور۔ ۱۵؍ اگست ۱۹۸۷ء

ایک معذرت:

یہاں میں جناب عبداللطیف اعظمی کے حوالے سے ایک بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ چند سال ہوئے میرے دل میں برادرِ عزیز و محترم کی طرف سے ایک رنجش سی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مجموعۂ مضامین

مرتب کیا تو دل میں رنجش موجود تھی جسے اُن کے مضمون کے شروع میں شامل نوٹ سے یا بعض حواشی اور اضافے سے محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن یہ مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا تھا کہ رنجش دور ہونا شروع ہوگئی اور برادرِ محترم کے اخلاص و محبت نے دل پر دوبارہ اثر کیا اور رنجش کے بجائے محبت و وداد نے دل میں جگہ پکڑ لی۔ یہ کوئی وقتی رو نہ تھی بلکہ ان کے اخلاقِ کریمانہ، خاکسار سے ان کی بے غرضانہ محبت، حضرت مولانا آزاد سے ان کے اخلاص و عقیدت، ان کے علمی کاموں خصوصاً ابوالکلامیات سے ان کے ذوق کی بنا پر ایک پائیدار تبدیلی ہے۔

تقریباً ایک سال سے ابتدائی صفحات کے سوا یہ مجموعہ چھپا پڑا تھا۔ طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ عزیز محترم اعظمی صاحب سے رنجش کے دور کا کوئی نقش یادگار رہے۔ اگر مالی حالات اجازت دیتے تو میں یہ مجموعہ ضائع کر دیتا لیکن حالات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ محترم اعظمی صاحب سے معذرت کرلی جائے۔ اگرچہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے متعلق میرے خیالات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس نوٹ سے جو کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ میرے جذبات اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔ البتہ محترم اعظمی صاحب کے مضمون کے متعلق اپنے اس تاثر سے رجوع کرتا ہوں کہ گویا انھوں نے مولانا آزاد کے خلاف سید صاحب مرحوم کے خیالات کو مرتب کر دیا ہے اور سید صاحب کے الزامات سے مولانا کا دفاع نہیں کیا یا مولانا آزاد کے خطوط کی روشنی میں سید صاحب مرحوم و مغفور کے فضائل و محامد کو مرتب کر دینا ان کا مقصود تھا یا آں محترم نے مولانا کے ایک خط کا اہم اقتباس کسی خاص جذبے کے تحت چھوڑ دیا تھا۔

پہلے میرا خیال تھا کہ دار المصنفین کے بعض اہل قلم کی طرح محترم اعظمی صاحب بھی سید صاحب مرحوم کے مخلص و معتقد اور مولانا آزاد کے محض رد دار مصنف ہیں لیکن حال ہی اُن کا ایک مقالہ نظر سے گزرا ہے، اُس نے اِس سے قطعی مختلف اثر پیدا کیا۔

مجھے اعظمی صاحب کی شرافت اور کرامت سے امید ہے کہ وہ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔

اقبال اور ابو الکلام کے ذہنی فاصلے

ڈاکٹر سید عبداللہ

اعترافِ کمال کی دنیائیں بھی محدود ہیں۔ اور معاصرین کی آنکھ، اپنے زمانے کی عظمتوں کے باہمی اقرار و تسلیم کے معاملے میں کچھ اور بھی تنگ ہوئی ہے۔

اس قلمرو میں دور کی چیز بہت بڑی، بہت حسین، اور بہت چمک دار ہوتی ہے۔ اور نزدیک کی عظیم و جسیم چیز بھی معمولی اور عام نظر آتی ہے۔

معاصرت ایک ایسا عیب ہے جو ہر کمال پر پردے ڈال دیتا ہے اس معاصرت کا زخم کھایا ہوا ایک مرزا غالب بھی تھا جس کی شکایت اس کاغذی لباس میں فریادی بن کر سامنے آئی ہے:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

بہر حال معاصرت میں باہمی بے قدری، ایک تسلیم شدہ امر ہے اور قدرتی بھی ہے اور اس کا گلہ بیکار ہے پھر بھی ارباب کمال کا یہ شیوہ قابل تعجب ضرور ہے۔

اس وقت جو نازک مسئلہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ اقبال اور ابو الکلام نے (جو ایک ہی عصر کے عظیم صاحبِ کمال تھے) ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا، مسئلہ اخلاقی ہے مگر جناب شورش کاشمیری نے اس عاجز کو کہ صلح پسند اور آشتی دوست ہے۔ اس اختلافی مبحث پر قلم اٹھانے کے لیے منتخب کیا۔ اور امر فرمایا کہ تلوار کی دھار پر چلنا ہے اور راست چلنا ہے۔ لغزشِ پا کا عذر مسموع نہ ہوگا۔ اپنی بے ہمتی اور بے علمی کے باوجود، قلم اٹھا رہا ہوں کہ شورش کا خوف سر پر مسلط ہے، یہ یاد رہے کہ سیاسی عقیدوں یا جانب داریوں کی دنیا جدا ہے اہل پاکستان کو ابو الکلام کی سیاست سے لاکھ اختلاف بھی ہوں اس سے تو متعصب آدمی بھی انکار نہیں کرے گا کہ وہ ایک عظیم الشان دریائے علم تھے بلکہ فضل و کمال کے بحرِ بے کراں۔ شاید اسی وجہ سے ایک زمانے میں اسلامیان ہند نے انہیں امام الہند کا خطاب عطا کیا تھا، ان کے کس کس کمال کا ذکر کیا جائے۔ ہزاروں فضیلتیں ایسی کہ ہر فضیلت پر فطرت بھی

تحسین کر رہی ہے؟ طب الآسان ہے، عالم، ادیب، مفکر، انشا پرداز خطیب، کے، بذلہ سنج خوش وضع، شعر فہم اور شاید شعر گو بھی ——— ! یعنی وہ جس نے دین اور فنون لطیف کے ڈانڈے ملا دیے۔ یعنی وہ جس نے ادب اور دین کو ایک رشتے میں پرو دیا۔ یعنی وہ جس نے ادب اور عمل کو اپنی ذات میں جمع کر کے خیالِ حسن کو عملی طور پر حسنِ عمل بنا دیا ——— یہ باتیں مبالغہ آرائی کی صفت میں نہیں آسکتیں یہ سیدھی اور راست حقیقتیں ہیں جن سے کوئی باتعصب آدمی ہی انکار کر سکتا ہے۔

! ——— اور اقبال؟ مسلمانوں کی ذہنی اور فکری تاریخ پر نظر دوڑائیے، شعر و فکر کے طوماروں اور سفینوں کی ورق گردانی کیجیے تو محسوس ہوگا کہ یہ واحد شخص صدیوں کے کمال کا ترجمان ہی نہیں اس کی مجسم تصویر ہے، تہذیب اسلامی کی روح فکری اور روح جمالی کا شناسا ——— اسلام کے عصر حاضر کو اسلام کی قدیم ترین دینی زندگی سے ملانے والا! مغرب کے استیلا کے عین عالم شباب میں، مشرق کا نقیب بن کر مغرب کو للکارنے والا اور یہ کہنے والا کہ ؎

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری

عجب آن است کہ بیمار تو بیمار تر است

ذہانت، فطانت، جامعیت، بذلہ سنجی و خوش گفتاری کا پیکر ——— فکر جدید و قدیم کی آمیزش و تطبیق میں یگانہ بے بدل عربوں کی شاعری سے عجمیوں کی نوا تک، ہر نغمۂ پُر جلال کا شناسا اور ماہر، اور عصری اور ادبیاتِ عالم کا ورق گرداں اور نقاد، اسلامی تہذیب کی توانائی کی روح اپنے زمانے کے تمدن میں بھرنے والا ——— شاعر مگر حکیم، حکیم مگر شاعر، اقبال ——— ! ماضی، حاضر اور مستقبل کے زمانوں کا راز دان!

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

دونوں بزرگ ایک ہی زمانے میں، ایک ہی ملک اور ایک ہی ماحول میں باندازِ بے التفاتی ——— ایک دوسرے کو دُور سے دیکھتے رہے ——— اور ایک دوسرے کے بارے میں، دوسروں کی زبانی، باتیں سنتے رہے ——— میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو اگرچہ جانتے تھے مگر ایک دوسرے کو پہچانتے بھی تھے یا نہیں اس میں مجھے شبہ ہے۔ اس اندازِ تغافل کو کس چیز پر محمول کیا جائے؟ رنگ ناآشنائی، معاصرانہ چشمک؟ یا اختلاف مزاج د

مشرب، مسلک ؟ ——— یہ بزرگوں کے معاملات ہیں، ناموروں کی باتیں ہیں، بڑوں کے مسائل ہیں، ایک خورد، ایک ذرۂ حقیر، خاکِ پا، ان جھگڑوں کی وجہ بیان کرے تو قصہ دار و رسن نہ سہی، سنگِ خلائق کا نشانہ بننا تو لازمی ہے کہا کیا جائے اور لکھا کیا جائے !

علامہ اقبال نے مسائل و مشکلات کے بارے میں صدہا اہلِ علم و فضل سے مشورہ کیا ——— اس فہرست میں اصاغر بھی ہیں اور اکابر بھی۔ علمائے دین بھی ہیں اور فضلائے جدید بھی ——— مگر فہرست سے جو نام غائب ہے وہ ابوالکلام کا ہے ——— مجھے معلوم نہیں کبھی دونوں ایک دوسرے سے ملے بھی ہوں (ممکن ہے ملے ہوں)، خط و کتابت بھی شاید ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ ایک آدھ خط تو نظر سے گزرا ہے۔

ادھر امام الہند نے تذکرہ سے لے کر غبارِ خاطر تک اپنی نثر کو فارسی اردو کے متعدد شعرا کے شعروں سے مزین کیا لیکن اگر نہیں کیا تو علامہ اقبال کے شعروں سے۔ داغ تک کے اشعار لکھے ہیں مگر اقبال کا کوئی شعر نہیں !

ناآشنائی کا یہ رنگ عجیب رنگ ہے، یہ معاصرانہ چشمک عجیب چشمک ہے یہ اختلاف مزاج عجیب، اختلاف مزاج ہے کہ ایک شخص دوسرے کے وجود ہی کا انکار کر دے اور مانے تو صرف اپنے آپ کو مانے ؎

ع ہم آپ ہی کو اپنا معبود مانتے ہیں؛

غور سے دیکھیے تو ابوالکلام اور اقبال کے مقاصد اور نصب العین بھی کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ یہ دونوں بزرگ اتحادِ اسلام تحریک کے علم بردار تھے دونوں ملتِ اسلام اور خلافتِ اسلامیہ کے داعی تھے دونوں جہاد اور سرفروشی کے مبلغ تھے۔ عمل، حسنِ عمل اور عشق و جنوں دونوں کا محبوب عقیدہ تھا ——— پھر بھی دونوں الگ، الگ سوچتے رہے، الگ الگ چلتے رہے اور بایں ہمہ قرب، دوریاں ان کو ایک دوسرے سے دور لے جاتی رہیں۔

جہاں تک میں سوچ سکا ہوں، کچھ بنیادی باتیں ان بزرگوں کے مابین ایسی ضرور تھیں۔ جن کی وجہ سے فاصلے پیدا ہوتے اور فاصلے بڑھتے گئے۔ اول یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں روحانی ادیبوں کی روحانیت، تصوف سے اپنے نمونے ڈھونڈھتی رہی۔ ابوالکلام کی روحانیت، اہلِ دین کو اپنا نمونہ بناتی رہی۔ اقبال کے یہاں مجذوبی عین کمال سمجھی گئی ابوالکلام کے یہاں، دعوت و عزیمت اور اس کے صلے میں سرفروشی اور قید و بند اور طوق و سلاسل کو اوجِ کمال خیال کیا گیا ——،

اقبال اور ابوالکلام کی زندگیوں میں بھی یہ فرق تھا اور ان کے فکر میں یہ فاصلہ نظر آتا ہے اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ اقبال کو تصوف کا مخالف سمجھا جاتا ہے حالانکہ اقبال کے سارے IDEAL امثالی نمونے سارے کے سارے عالم تصوف سے تعلق رکھتے ہیں، رومی، شبستری، سنائی، عراقی، گنگوہی (شیخ عبدالقدوس) سبھی صوفی تھے؛ اقبال کے محبوب کردار یہی لوگ تھے یا وہ اہل قوت اور صاحب سطوت سلاطین یا علما تھے جن کی زندگی صلابت اور سخت کوشی کا مظہر تھی۔

سوال یہ ہے کہ اقبال نے ان صوفیائے کبار کو کیوں نمونہ بنایا ——؟ اس کا تعلق اقبال کی تربیت سے ہے۔ اقبال کے اکتسابات میں فکریات اور ادب و شعر کو غلبہ حاصل ہے۔ اقبال فلسفہ کے طالب علم تھے اور اس کے علاوہ انہیں سب سے زیادہ شغف شعر و ادب قدما سے رہا —— اور ظاہر ہے کہ اس راستے میں، ان کی ملاقات یا تو عظیم مفکروں سے رہی یا عظیم شاعروں سے، اور انہی میں صوفی شعرا بھی شامل تھے۔

ابوالکلام کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی —— انہوں نے علم دین، تفسیر و حدیث اور دوسرے دینی علوم کا مطالعہ سب سے پہلے کیا۔ اور اپنی ذہانت کی بنا پر بہت جلد علوم پر حاوی ہو گئے۔ خوش مذاقی فطرت میں موجود تھی۔ شبلی کے قرب نے اور بھی اس جوہر کو چمکا دیا۔ مگر ان کا اصلی اور بنیادی اکتساب عالم دین کی حیثیت سے تھا۔ اعتقاداً وہ عدم تقلید کے قائل تھے —— اور ظاہر ہے کہ عدم تقلید کی سزا سبھی کو ملتی رہتی ہے مگر اس کا انعام یہ ملتا ہے کہ حق گوئی اور مقابلہ و مقاومت زندگی اور ذہن کے عناصر بن جاتے ہیں۔ اس راستے میں ابوالکلام کی انہی بزرگوں سے ملاقات ہوئی جن کی زندگی میں اعلائے کلمۃ الحق، اپنے عقیدے کے لیے صعوبت کو برداشت کرنا، طوق گراں اور زنجیر کی گرانباری اور دار و رسن جیسے ہنگامے نمایاں تھے۔ امام احمد بن حنبل سے امام ابن تیمیہ تک اور ان سے لے کر خاص اپنے بزرگوں تک اہل دین میں جتنے حق گو مجاہد انھیں نظر آئے، وہ سب ان کے محبوب تھے۔ انھوں نے دین اور عشق دین کو ایک روحانی قدر بنایا۔ اور اسی اساس پر اپنے ادب کی بنیاد رکھی۔ صوفی رجحانات، ان کے عقیدے اور مذاق کی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ ابوالکلام کے یہاں جنوں اور مجذوبی کی باتیں ہیں، مگر ان کا جنوں یعنی عمل و حرکت کے محور کے گرد گھومتا ہے۔ ان میں COGNITION تجلی علمی نہیں آئی۔

ابوالکلام کے اہل جنوں، عقیدے کی پختگی کے مظہر ہیں۔ وہ چٹان کے مانند، اپنے عقیدے میں سخت

ہیں اور سخت شدائد میں بھی ان عقیدوں سے منحرف نہیں ہوتے۔ جابر اور جائر سلاطین کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں ہنگامہ رسوائی کو برداشت کرتے ہیں مگر اعلائے کلمۃ الحق کو جاری رکھتے ہیں۔

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم واروز تو ہنگامہ رسوائی را

اقبال کے اہل جنوں بھی عمل اور جدوجہد کے پیکر ہیں مگر ان کے نزدیک جنوں ایک عنصر ہے، صاحب جنوں کو لذات علمی سے زیادہ لذات عملی حاصل ہوتی ہیں ـــــ، تجلیات، سرچشمہ جنوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں، ابوالکلام اور اقبال کے مابین ایک قدر مشترک قوت اور محکمی بھی ہے مگر فرق یہ ہے کہ ابوالکلام کے کردار صابری میں اپنی قوت ظاہر کرتے ہیں اقبال کے کردار قاہری میں اپنا جلال دکھاتے ہیں ہنگامے کے قائل نہیں؛ وہ شعلۂ بے باک کے مانند، تر و خشک کو بھسم کر سکتے ہیں ان کے کرداروں میں مظلومی اور مجبوری کا وہ رنگ نہیں پایا جاتا ہے جو ابوالکلام کے اہل دین میں نظر آتا ہے ان کی یلغار، قاہرانہ ہے، بالا دستی اور غلبہ اقبال کے تصور کا اساسی اصول ہے یہاں اقبال کی منزل ابوالکلام سے بہت آگے ہے۔

یہ فرق کیوں؟ ابوالکلام کی نظر ماضی پر پڑتی ہے اقبال نصب العینی مفکر ہیں ـــــ، ابوالکلام کے ہاں "جو تھے" وہ قابل تقلید ہیں اقبال کے یہاں "جو ہو سکتے ہیں" قابل توجہ ہیں، اقبال کا فلسفہ پیکار اور نظریۂ جدل بھی کار فرما ہوا ہے اقبال کی خودی پیکار سے تقویت پاتی ہے۔ ابوالکلام کی خودی، حق گوئی اور صابری کی حدود میں محدود ہو کر یلغار کی اجازت نہیں دیتی ـ ابوالکلام کی خودی محتاط معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کی خودی۔ وضعِ احتیاط سے گھبرا اٹھتی ہے۔ اقبال کے یہاں جھپٹنے اور بخیہ ادھیڑ دینے کا رجحان ہے ابوالکلام کے یہاں جھپٹنے والوں کے مقابلے میں، استقامت دکھانے کا میلان پایا جاتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے ان بزرگوں کے ساتھ کہاں تک انصاف کر سکا ہوں ـــــ مگر اس حد تک مطمئن ہوں کہ دانستہ تنقیص کا مرتکب نہیں ہوا ہوں۔

ان بزرگوں کی شخصیت میں بھی باہم تضاد کے کچھ پہلو نظر آتے ہیں۔ ابوالکلام چونکہ اہل دین میں سے تھے۔ اس لیے وہ جب اپنی شخصیت کی توسیع کرتے ہیں تو اپنی زندگی میں جدیدیت کا ایک رنگ پیدا کرتے ہیں، وہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ زندگی کی رنگینیوں کے منکر نہیں۔

زمن حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم ـــ نہفتہ کافرم و بت، در آستیں دارم

وہ اپنی کام جوئیوں اور کامرانیوں کے ذکر میں اطناب سے کام لیتے ہیں ـــــ اور اپنی آشفتگیوں کا تذکرہ ایسے رندانہ انداز میں کرتے ہیں جس کی شدت، مبالغہ کی حد سے جا ملتی ہے، وہ چائے نوشی کے پردے میں بادہ گساری کے خیالی مزے لیتے ـــــ اور فنونِ لطیفہ سے اپنی دلچسپیوں کی حکایت بیان کرتے وقت ہر جدید المذاق آدمی کو یہ اطمینان ضرور دلا دیتے ہیں کہ وہ جدید رنگِ زندگی کے بہت قریب ہیں۔

اقبال جدید تعلیم سے بہرہ ور تھے، اس لیے انھیں اس قسم کا اطمینان دلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ ابوالکلام کے برعکس، جدید زندگی کے نقاد تھے۔ فنونِ لطیفہ پر ان کی تنقید، سینما اور تھیاٹر کی تنقیص اور تہذیبِ افرنگ کی ہر ہر شے کی کھلی مخالفت ان کی نظم و نثر میں جابجا موجود ہے۔ اقبال کی کوشش یہ ہے کہ اہلِ دین بھی ان کی رفاقت اور ہم زبانی کریں ـــــ وہ علامہ سلیمان ندوی، علامہ انور شاہ کاشمیری اور دوسرے علمائے دین سے قربت کے متمنی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اہم مسائل میں ابوالکلام کے نقطۂ نظر میں وسیع المشربی کا میلان پایا جاتا ہے اور اقبال کے نقطۂ نظر میں سختی اور تشدد کا رنگ نظر آتا ہے، قادیانیوں کے متعلق اقبال کے خیالات سب کو معلوم ہیں مگر ابوالکلام کی کوئی متشددانہ رائے ان کے بارے میں ظاہر نہیں ہوتی، قتل مرتد کے مسئلے پر بھی یہی حال ہے غرض اس نوع کے جملہ مسائل میں ابوالکلام کا میلان لبرل اور اقبال کا میلان متشددانہ ہے۔

یہ قصہ ہے تو عجیب مگر ہے ضرور، اور یہی تو فطرتِ انسانی کی بوالعجبی ہے ـــــ انسانی شخصیت بھی عجب مجموعۂ اضداد ہے۔ دامن اور بندِ قبا کے یہ فرق ہر انسان میں نظر آتے ہیں اور نابغہ شخصیتوں کا تو عالم ہی اور ہے، یہی ایک بات دیکھ لیجیے کہ ابوالکلام اور اقبال دونوں نے فارسی شاعری سے استفادہ کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ دونوں فارسی شاعری کے رازداں اور رمز آشنا تھے مگر انتخاب دیکھیے۔ ابوالکلام کے منتخب اشعار میں آشفتگی اور جنوں کے ساتھ لطافت اور رنگین مزاجی کے مضمون پائے جاتے ہیں اس کے برعکس اقبال کے انتخاب کردہ شعروں میں آشفتگی کے ساتھ قوت و حرکت زندگی اور فکری نکتہ رسی اور فلسفیانہ حقائق کے برجستہ بیان کو اہمیت حاصل ہے۔ صرف انتخابِ اشعار ہی کو لے لیجیے، شخصیتوں کا مقابلہ ہو جائے گا، فاصلے آخر فاصلے ہیں رائی پربت بن جاتی ہے اور تل کے اوٹ پہاڑ تو پرانی بات ہے، ان دوریوں اور نزدیکیوں کا غم کیوں کھایئے ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے بیسویں صدی کی اسلامی دنیا میں اپنے فکر و عمل سے ایک ایسی جنبش پیدا کی جس سے زمانے کی سیاست بھی متاثر ہوئی اور ملی زندگی نے دیرپا اثرات قبول کیے، سمت الگ سہی مگر دائرہ کے گرد گھومنے والی سوئیاں سمت کے اختلاف کے باوجود محور کی وحدت سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

دو شخصیتوں کا موازنہ اور مقابلہ کسی ایک شخصیت کے ارادت مندوں کے لیے دل شکنی کا باعث بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک شخصیت کے سہارے دوسری شخصیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں جو مدد ملتی ہے اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر احتیاط کی جائے تو کسی ایک شخصیت کے عقیدت مندوں کی دل شکنی کے بغیر بھی شخصیات کے مطالعے کا یہ مفید اور دل چسپ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہم اسی قسم کی ایک کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں تفصیلی مطالعہ مقصود نہیں ہے بلکہ محض ارشارات مقصود ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی دو ایسی شخصیتیں ہیں جن کے افکار و خیالات، عقائد و نظریات، اندازِ فکر و نظر اور زندگی کی اٹھان میں سب سے زیادہ مناسبت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔

مولانا سندھی عمر میں مولانا آزاد سے تقریباً ۱۶ برس بڑے تھے۔ مولانا سندھی مارچ ۱۸۷۲ء میں اور مولانا آزاد اگست ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوتے، مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین دہلوی مذہبی زندگی میں رسمی و روایتی طریقے کو پسند کرتے تھے۔ مذہبی عقائد و اعمال میں یہ رسمی طریقہ وہی تھا جس نے بعد میں "بریلویت" کا نام اختیار کیا اور آج "بریلوی مکتبہ فکر" کے نام سے اس گروہ کو عام طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کو یہ رسمی مذہبی زندگی پسند نہ آئی، ان کی فطرتِ صالحہ نے شروع ہی میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اسلام محض چند رسوم کا نام ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد کی تعلیم میں شروع ہی سے بڑا اہتمام اور تربیت میں بڑی سختی کی گئی تھی، ابتدائی تعلیم خود ان کے والد نے دی، جب ذرا آگے بڑھے تو دوسرے اساتذہ کو مقرر کیا گیا، لیکن ان کی علمی استعداد اور خاص طور پر ان کے مذہبی عقائد کو خوب جانچ پرکھ لیا گیا تھا۔ گھر میں کسی ایسے شخص کا گزر نہ تھا جس کے عقائد کے بارے میں شک و شبہ ہو، باہر آنے جانے کی بھی آزادی نہ تھی، باہر نکلتے تو خادم ساتھ ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سختیاں اور بندشیں ہمیشہ باقی نہ رہ سکتی تھیں، خود بخود حالات ایسے پیدا ہوتے گئے کہ

باہر کی دنیا سے ربط وضبط بڑھا اور گنبد سے باہر کی بھی ہوا لگی۔ ۱۱ سال کی عمر میں شعر وشاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس شوق نے علمی وادبی کتب ورسائل تک رہنمائی کی، اس زمانے کے تمام مشہور مصنفین کی کتابیں مطالعہ میں آئیں۔ سرسید کی شخصیت سے خاص طور پر متاثر ہوئے، انہی کی کتب ورسائل سے امام غزالیؒ کے بعض رسائل دیکھنے کا شوق ہوا۔ کتب بینی کے اس شوق نے ایک اہلِ حدیث عالم کا کتب خانہ خریدوایا۔ اس میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی کتابیں موجود تھیں، اس طرح رفتہ رفتہ حالات ایسے پیدا ہوتے جو انھیں ان کے والد کے مقابلے میں دوسری انتہا پر لے جانے میں ممد ومعاون ثابت ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور خانوادۂ ولی اللہی سے ان کے کان پہلے ہی آشنا تھے۔ ان کے والد اسی سلسلۂ درس وتدریس سے تعلق رکھتے تھے لیکن مولانا آزاد کی تعلیم وتربیت میں انھیں اس خانوادۂ علمی سے ایک خاص انداز میں واقف کرایا گیا تھا۔ حضرت نواب صاحب اور دیگر حضرات کی کتب ورسائل کے مطالعے سے انھیں خانوادۂ ولی اللہی کے علوم وافکار اور اس کی خدماتِ جلیلہ کے ایک دوسرے پہلو سے بھی واقفیت ہوئی جو ابھی تک ان کی نظروں سے شاید بالکل اوجھل تھا۔

مولانا آزاد کی طبیعت نے جو نیا رُخ اختیار کرنا شروع کیا تھا اس میں ایک شخصیت کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ شخصیت مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کی تھی۔ مولوی صاحب مرحوم پٹنہ کے ایک سرفروش اور مجاہد خاندان سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد کا نام مولوی یحییٰ علی تھا۔ جو حضرت سید احمد بریلوی کی تحریکِ اصلاح وجہاد کے ایک خاص رکن تھے، حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد تحریک دو حصوں میں بٹ گئی، صادق پوری جماعت کے امیر مولانا ولایت علی تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی عنایت علی امیر بنے۔ جب انھوں نے سرحد کو ہجرت کی تو جماعت کا تمام نظام مولوی یحییٰ علی کے ہاتھ میں آ گیا جنھیں ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت میں حصہ لینے کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اور وہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔ مولوی رنجور مرحوم بورڈ آف اکزامینرس کے چیف مولوی تھے، آپ کہنہ مشق شاعر تھے اور کلکتہ کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کو شعر وشاعری کا شوق ہوا اور مشاعروں میں شرکت شروع کی تو مولوی رنجور مرحوم سے بھی ملاقات ہوا اور رفتہ رفتہ گہرے مراسم اور مخلصانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ مولانا آزاد کے جو مکاتیب مولوی رنجور کے نام ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے خیالات کی تبدیلی اور ان کے والد کے الفاظ میں "گمراہی" کا باعث مولوی صاحب مرحوم تھے۔ غرضیکہ مولوی رنجور کے ذریعہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح وجہاد، ان کی جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں، حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی

سرفروشانہ و جاں سپارانہ زندگی، اصلاحِ مسلمین کے سلسلے میں ان کی عظیم الشان خدمات اور ان کی مومنانہ فراست اور مجاہدانہ کردار سے پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں واقف ہوئے، مولانا آزاد کے والد حضرت اسمٰعیل شہید کے کفر پر ایمان رکھتے تھے اور اس معاملے میں ان کے غلو اور تشدد کا جو عالم تھا۔ وہ مولانا ملیح آبادی کی روایات (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی) سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ مولانا آزاد بھی اس پر افسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے والد کی انتہا پسندی کے مقابلے میں مولانا آزاد حضرتِ شہیدؒ کو "مجدد سلطانِ وقت اور اسکندرِ عزم" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ کے کام کو مولانا آزاد نے "تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد" تک محدود رکھا ہے لیکن حضرتِ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے کام کو "عملاً تجدیدِ اسلام و احیاے دین اور فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع" سے تعبیر کیا ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر "حضرتِ مجدد شہید کے زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ بھی ہوتے تو انہی کے جھنڈے تلے ہوتے"۔ مولانا آزاد کو فکر و نظر کے اس مقام تک پہنچانے میں یقیناً دوسرے عوامل بھی تھے، لیکن اس معاملے میں مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی صاحب مرحوم کی تحریک پر مولانا آزادؒ نے "الدر المنثور فی تراجم اہلِ صادقفور معروف بہ تذکرۂ صادقہ" پر ایک تقریظ اور قطعہ تصنیف (سنہ ۱۳۱۹ھ مطابق سنہ ۱۹۰۱ء) اور قطعۂ تاریخِ طباعت (سنہ ۱۳۲۰ھ مطابق سنہ ۱۹۰۲ء) بھی لکھا تھا جو تذکرۂ صادقہ میں شامل ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کی فرمائش پر مولانا نے ایک تقریظ فارسی نظم میں بھی لکھی تھی جس کی طرف مطبوعہ تقریظ میں اشارہ موجود ہے، لیکن یہ تقریظ دقتِ گنجایش کی وجہ سے شاملِ کتاب نہ ہو سکی تھی، یہ نایاب و غیر مطبوعہ فارسی زبان میں منظوم تقریظ مولوی صاحب مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے دستیاب ہو گئی ہے[1]۔ پھر انھوں نے سنہ ۱۹۰۴ء میں لسان الصدق میں تذکرۂ صادقہ پر شاندار تبصرہ فرمایا۔[2]

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو بھی اس قسم کے حالات سے سابقہ پڑا۔ مولانا سندھی ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ لیکن یہ رسمی مذہب ان کو مطمئن نہ کر سکا، غور و فکر کا مادہ ان کے اندر ابتدائی عمر سے تھا، ان کی صالح فطرت نہ کسی غلط بات کو قبول کر سکتی تھی نہ انقلابی طبیعت کسی رسمی چیز پہ مطمئن ہو سکتی تھی، انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں یہ محسوس کر لیا کہ مذہب محض چند رسوم کا نام نہیں ہو سکتا۔ مذہب زندگی کے ایک عقیدہ کا نام ہے اور عقیدہ کی بنیاد حقائق پہ ہونی چاہیے نہ کہ محض چند رسوم و

---

[1] دیکھیے تذکرہ [2] ارمغان آزاد (مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری) میں یہ تقریظ مع عکس شامل ہے

روایات پر ــــــ زندگی کا عقیدہ بنانے کے لیے انھیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت تھی جس کی بنیاد رسوم وروایات کی بجائے حقائق پر ہو۔ اُن کی طلب وجستجو نے انھیں اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ وہ حقیقی اور سچا مذہب جس کی انھیں طلب وتلاش ہے۔ ان کا اپنا آبائی مذہب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس وقت تک مولانا سندھی نہ تو سکھ مذہب اور ہندو مذہب کا گہرا مطالعہ کر سکے تھے نہ اسلام ہی سے قریبی اور صحیح واقفیت تھی لیکن معمولی اور سطحی سوالات کا جواب بھی سکھ اور ہندو مذہب کے مقابلے میں انھیں اسلام میں اطمینان بخش نظر آتا تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر انھیں ایک سخت کش مکش سے گزرنا پڑا۔ ایک طرف ماں کی تمنائیں، اور اس کے ارمان تھے بہن کی محبت اور اس کا پیار تھا اور ماموں کا شفقتیں تھیں، لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد ان محبتوں، شفقتوں، لاڈ اور پیار کا مرکز بنا رہنا تو درکنار، اس گھر میں بھی نہ رہ سکتے تھے، یہ دو ایسی انتہائیں تھیں، جن کی درمیانی راہ بھی کوئی نہ تھی، اگر ماں، بہن اور ماموں کی محبت کی طرف دیکھتے ہیں تو زندگی کے صحیح اور بلند عقیدے سے محروم رہتے ہیں اور عقیدے کی صحت و درستگی کا خیال کرتے ہیں تو اعزہ کی محبتوں کا انھیں مایوس کُن جواب دینا پڑتا ہے لیکن ان کی صالح فطرت، عقیدہ اور نظریہ کے بارے میں کسی غلط چیز کو قبول بھی نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے گھر چھوڑ دینے کا قطعی اور آخری فیصلہ کر لیا۔ اُن کا فیصلہ اٹل اور عزم راسخ تھا، ایک شب تنِ تنہا گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

مولانا آزاد کو بھی زندگی کے ابتدائی دور میں اسی قسم کی کش مکش سے گزرنا پڑا۔ جو عقیدہ ان کے دل میں جگہ پا رہا تھا، وہ ان کے والد مرحوم ومغفور کی نظر میں اتنا ہی قابلِ نفرت تھا، جتنا کہ مولانا سندھی کے ماموں اور ماں کی نظر میں "اسلام" ہو سکتا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ قابلِ نفرین، ایک سکھ ایک مسلمان کو گوارا کر سکتا ہے لیکن مولانا خیر الدین مرحوم کی خوش عقیدگی اسلام کے بارے میں ان تصورات کو گوارا نہ کر سکتی تھی، جو اُن کے بیٹے (ابو الکلام آزاد) کے دل کو اچھے لگتے اور صحیح معلوم ہوتے تھے، اس زمانے میں مولانا آزاد کو سخت ذہنی کلفتوں اور کشمشوں سے گزرنا پڑا۔ ابھی تک وہ باپ، بھائی اور بہنوں کے چہیتے تھے۔ لیکن جوں ہی ان کے موروثی عقائد میں تبدیلی ہوئی وہ گھر بھر کی نفرتوں کا مرکز بن گئے، لیکن عقیدے معاملہ میں انھوں لے بھی کسی ایسی چیز کو گوارا نہ کیا جو ان کے خیال میں صحیح نہ تھی، یہ کش مکش صرف چند دن کی نہ تھی بلکہ برسوں انھیں اِن حالات سے مقابلہ کرنا پڑا، ان کی خاندانی زندگی اور روایات ایک طرف تھیں اور ان کی بے میل طبیعت اور صالح فطرت

دوسری طرف رہنمائی کررہی تھی، انھوں نے اپنی صالح فطرت کی آواز پر لبیک کہا اور ان تمام مشکلات اور مصائب کو برداشت کرلیا جو اس راہ میں انھیں پیش آتے۔ مولانا آزاد اور مولانا سندھی کی سیرتوں کا یہ پہلو پوری طرح نمایاں ہے کہ وہ اصول اور عقیدے کو حالات کے کسی موڑ پر اور کسی مرحلے میں چھوڑنا گوارانہ کرسکتے تھے، وہ دوسروں کو اس بات کا حق دیتے تھے اور اس سے ہمیشہ خوش ہوتے تھے کہ ان کے اصول اور فکر ونظر سے اختلاف کیا جاتے لیکن یہ بات ان کے نزدیک دیانت کے خلاف تھی کہ علم وبصیرت کے خلاف محض کسی دباؤ یا لالچ کی بنا پر اصول ترک کردیا جائے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی اور مولانا آزاد دونوں کے حالات میں بہت بڑا فرق ہے، ایک کو اپنا آبائی مذہب ترک کرکے ایک دوسرا مذہب اختیار کرنا پڑا، دوسرے نے اسلام کے صرف ایک فرقے کے عقائد سے انکار کیا اور اسلام ہی کے دوسرے فرقے کے عقائد کو اپنالیا، لیکن مزاجاً دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ مولانا آزاد کے والد کی نظر میں دوسرا مسلک رکھنے والے مسلمان ویسے ہی کافر تھے جیسے ہندو یا سکھ ہوسکتے تھے۔ کم ازکم مولانا خیرالدین حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں ایسا ہی عقیدہ رکھتے تھے۔

مولانا سندھی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ذریعے شاہ ولی اللہ کے فکر، سید احمد بریلوی کی تحریک اصلاح وجہاد اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا کارناموں سے واقف ہوتے، مولانا آزاد کی شناسائی بھی ابتداہی میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادہ وتربیت یافتگان اور اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں سے ہوگئی۔ اس طرح برصغیر پاک وہند کی یہ دونوں بزرگ ہستیاں ایک ہی سرچشمہ سے فیضیاب ہوئیں۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کے انکار اور انداز فکر میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے، بلکہ دونوں کے کردار میں بھی اس قدر مطابقت پائی جاتی ہے، جو برصغیر کے دیگر دو علما میں نظر نہیں آتی

مولانا عبیداللہ سندھی مولانا آزاد سے واقف اور ان کی الہلال کی تحریک سے متاثر ہوتے، انھوں نے مولانا آزاد کے طریقۂ کار سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس کا ساتھ دیا۔ مولانا آزاد کی "حزب اللہ" اور مولانا سندھی کی نظارۃ المعارف القرآنیہ" ایک ہی تحریک کی دو صورتیں تھیں، دونوں کے مقاصد ایک ہی تھے، فرق صرف یہ تھا کہ مولانا آزاد نے حزب اللہ کی تنظیم کسی جامعہ یا دارالعلوم کے طلبہ تک محدود نہ رکھی جب کہ مولانا سندھی نے دارالعلوم دیوبند کے قدیم طلبہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ان کی تنظیم وتربیت کے لیے ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں

مولانا سندھی حضرت شیخ الہند کے حکم سے کابل چلے گئے اوائل سنہ ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کو کلکتہ سے نکل جانے کا حکم ملا۔ مولانا رانچی چلے گئے اور کچھ دن بعد وہیں نظر بند کر دیے گئے۔ ان وجوہ سے حزب اللہ اور نظارۃ المعارف القرآنیہ کی تحریک و تنظیم ختم ہوگئی۔

تحریک الہلال کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "ہم سب اپنا اصل کام بھولے ہوئے تھے الہلال نے یاد دلایا"، ہند پاکستان کے چوٹی کے علما میں حضرت شیخ الہندؒ کی واحد شخصیت تھی جس نے تحریکِ الہلال کی اہمیت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور یہ خیال کیے بغیر کہ داعی ایک ایسا نوجوان ہے جس کی عمر ۲۵، ۲۶ برس سے زیادہ نہیں، مولانا کی دعوت کو قبول کر لیا۔

ترجمان القرآن جلد دوم میں سورۂ توبہ کی آیت ۴۹ کے حاشیہ میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"سنہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا، ہندوستان کے علما و مشائخ کو عزائم و مقاصدِ وقت پر توجہ دلاؤں، ممکن ہے چند اصحابِ رشد و عمل نکل آئیں، چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی، لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ ائذن لی ولا تفتنّی۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی۔" (صفحہ ۹۵)

عام طور پر لوگ الہلال کی دعوت اور اس سے متعلق علما کے تاثر سے واقف ہیں لیکن وہ اس سے واقف نہیں کہ علماء کو عزائم و مقاصدِ وقت کی طرف مولانا سندھی کے ذریعے مولانا آزاد نے توجہ دلائی تھی۔ مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام ایک خط میں التزامِ جماعت اور اتباعِ سوادِ اعظم کے سلسلۂ بحث میں مولانا فرماتے ہیں:

"سنہ ۱۹۱۴ء میں جب میں نے ہندوستان کے بعض اکابر علما و مشائخ کو عزم و سعی کی دعوت دی بعض سے خود ملا، اور بعض کے پاس مولانا عبید اللہ سندھی کو بھیجا تو اکثر نے بعینہٖ یہی بات کہی تھی جو آپ کہہ رہے ہیں، یعنی علما و مشائخ کی اتنی بڑی تعداد ملک میں موجود ہے، کسی نے بھی آج تک یہ دعوت نہیں دی۔ اب سوادِ اعظم کے خلاف قدم کیوں اٹھایا جا رہا ہے؟ ان ھٰذا الا اختلاق![1]"

---

[1] تبرکاتِ آزاد صفحہ ۲۸ مرتبہ مولانا غلام رسول مہر صاحب۔

لیکن یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ مولانا سندھی کا تعارف مولانا آزاد سے خود حضرت شیخ الہندؒ نے کرایا تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل میں ایک مدت گزارنے، بین الاقوامی سیاسی حالات خصوصاً اسلامی ممالک کی سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنے لیے کچھ اصول ترتیب دیے اور ایک مخصوص طریقہ کار اختیار کیا۔ تقریباً انھی دنوں مولانا آزاد نے رانچی کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر حالات پر از سرِ نو غور کیا۔ اور ہندوستان کے مخصوص حالات میں اپنے لیے ایک مذہب عمل ترتیب دیا۔ اس بات کو محض اتفاق قرار نہیں دیا جاسکتا کہ دونوں بزرگ ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ مولانا آزاد کے مذہبِ عمل اور مولانا سندھی کے اصول و طریقِ کار میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ دونوں کی نظر عمیق تھی، دونوں کا اندازِ فکر اور طریقِ تجزیۂ حالات ایک تھا۔ اور دونوں ولی اللٰہی فکر اور مسلک سے متاثر تھے، اس لیے جوں ہی حالات نے دونوں کو غور و فکر پر مجبور کیا۔ دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے اور دونوں ان اصولوں پر قائم ہوگئے، حالاں کہ دونوں بزرگوں کی زندگی مختلف حالات میں بسر ہوتی اور دونوں کی زندگی میں ایسے بے شمار مواقع آئے کہ ہر شخص ان حالات میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن چوں کہ دونوں کو اپنے نظریات اور بنیادی اصولوں پر کامل یقین تھا اس لیے فروعات میں کوئی ایسی بات گوارا نہ کی جو ان کی بنیادی اصولوں اور نظروں کے خلاف ہوتی۔ اس اصول پسندی اور استقامت کی وجہ سے دونوں کو عوام و خواص کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور بعض بڑے کٹھن مرحلے آئے لیکن انھوں نے اپنے نظریات کو نہ چھوڑا اور اصل پر فروع کو کبھی ترجیح نہ دی۔

مولانا آزاد اور مولانا سندھی کے اندازِ فکر کی ایک بڑی خوبی اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے، دونوں بزرگ معاملات و مسائل پر غور کرتے ہوتے اس کے پس منظر کو نظر انداز نہیں کرتے۔ نیز مسئلے کی عملی حیثیت کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے، ان کے نزدیک زندگی اور زندگی کے مسائل و مطالبات کا جواب جذبات اور منطق سے نہیں دیا جاسکتا، ان کے اندازِ فکر کی اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جب وہ انسانی صلاح و فلاح کی کسی ایک سطح پر سوچتے ہیں تو اس سے بلند تر سطح و تقاضوں اور ادنیٰ سطح کی ضرورتوں سے آنکھیں بند نہیں کر لیتے۔ یعنی اگر وہ ملکی اور قومی سطح پر انسان کی صلاح و فلاح کی بات سوچیں گے تو اس سے بلند تر (بین الاقوامی) سطح کے تقاضے یا اس سے ادنیٰ (جماعتی) سطح کے حالات اور ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ لیکن

وہ انفرادی مفاد کے مقابلے میں اجتماعی اور کسی مخصوص گروہ یا جماعت کے مفاد کے مقابلے میں عمومی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

دونوں بزرگ ملتِ اسلامیہ کے رہنما تھے، لیکن رہنمائی کے عام تصور سے ان کا دماغ ناآشنا تھا، رہنمائی کے عام تصور سے میری مراد ملت کے مطالبات اور خواہشات کی محض ترجمانی اور سپردگی ہے۔ حالاں کہ کبھی یہ خواہشات غلط بھی ہوتی ہیں اور مطالبات کسی دوسری جماعت کے بہت بڑے نقصان کا باعث بھی ہو سکتے ہیں۔ رہنمائی کے عام تصور کے مطابق جانتے بوجھتے ہوتے بھی ایک رہنما کو ان غلط رجحانات اور مطالبات میں قوم کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ حقیقتاً یہ مقام قوم کے رہنما کا نہیں ہوتا بلکہ قوم کے ترجمان اور وکیل کا ہوتا ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا سندھی ان معنوں میں قوم کے رہنما نہ تھے۔ انھوں نے اپنی بصیرت اور علم کے مطابق قوم کی رہنمائی کی، لیکن محض ترجمان بننے کا ننگ گوارا نہ کیا۔

اس قسم کی شخصیت کبھی کسی قوم یا گروہ کی مقبول ترین رہنما شخصیت نہیں بن سکتی۔ لیکن رہنمائی کا جامہ ایسی ہی شخصیت پر زیب دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو اپنا کر دونوں شخصیتوں کے بارے میں غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ان کے کردار میں کوئی اینچ پیچ نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دونوں کو زندگی میں کبھی اصول ونظریات کی صحت میں شبہ نہیں ہوا۔ لیکن وہ حضرات جو رہنمائی کے مقام کے مقابلے میں ترجمانی کے منصب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، ان کے خیالات اُلجھے ہوئے اور کردار بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے مختلف طبقات میں ہر وقت خیالات کا تصادم اور مفادات کی کش مکش جاری رہتی ہے اور ان رہنماؤں کو اس کی تائید و ترجمانی کرنی پڑتی ہے۔ اس طبقاتی کشمکش اور تصادم سے ان کا ذہن و فکر اور کردار متاثر ہوتا رہتا ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا سندھی چوں کہ اس قسم کے رہنما نہ تھے اس لیے قوم کے طبقاتی خیالات کے تصادم اور گروہی مفادات کی کشمکش سے ان کا ذہن و فکر کبھی متاثر نہیں ہوا، نہ اُن کے کردار پر اس کا اثر پڑا۔ قوم کے اندرونی اور بیرونی تصادموں اور کشمکشوں میں وہ زندگی کے بلند اصول و افکار کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ دونوں کا بہت وسیع و عمیق ہے۔ واقعات و حالات کے متعلق اندازِ فکر و تجزیہ دونوں کا ایک سا ہے۔ وہ محض تاریخ کے بیانات اور اشخاص و رجال کے دعاوی ہی کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کا حقیقی پس منظر تلاش کرتے ہیں اور بڑے کُھلے دل و دماغ کے ساتھ نتائج قبول

کر لیتے ہیں۔ حالات اور واقعات کا تجزیہ کرنے میں اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے، ان کے نزدیک ہر کشمکش اور خون ریزی جو اسلام کے نام پر کی گئی اس کے پس منظر میں اسلامی جذبہ ہی کارفرما نہ تھا۔ بعض اوقات یہ مخصوص سیاسی رجحانات اور گروہی مفادات کی کشمکش اور جنگ ہوئی اور اس میں اسلام کو بطور ایک آلہ کے استعمال کیا گیا۔ مثلاً سرمدؒ کا قتل کوئی اسلامی مسئلہ نہ تھا، اس کا پس منظر قطعی سیاسی تھا۔ عالمگیر ایک مذہبی اور راسخ العقیدہ شخص تھا لیکن دارا شکوہ کے مقابلے میں اس کی جہد وسعی قطعی سیاسی تھی۔ مذہبی شخص ہونے کے ساتھ وہ ایک سیاسی اور عملی انسان بھی تھا۔ جانتا تھا کہ اگر وہ دارا شکوہ کے مقابلے میں نہ آتے اور سیاست وحکومت سے بے نیازانہ ہاتھ کھینچ لے، جب بھی اسے کسی گوشے میں اطمینان وسکون سے نہ بیٹھنے دیا جاتے گا۔ اور بہر صورت اسے حکومت کے راستے کا بھاری پتھر ہی سمجھا جائے گا۔ کشمکش اور جنگ لازمی تھی پس اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہی حکومت واقتدار کے دوسرے مدعی کو کیوں نہ اپنے راستے سے ہٹا کر اطمینان وسکون حاصل کرلے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اگر دارا شکوہ ٹھیک وہی عقائد رکھتا ہوتا جو عالمگیر کے تھے جب بھی اس کشمکش سے نہ بچا جا سکتا تھا۔ جنگ لازمی تھی۔ پس عالمگیر نے وہی کیا جو ایک مدبر بادشاہ کو کرنا چاہیے تھا۔ دارا شکوہ کے مقابلے میں عالمگیر کی جہد وسعی کے بارے میں جو عام تصور ہے، مولانا اس سے پوری طرح متفق نظر نہیں آتے۔

مولانا عبید اللہ سندھی زندگی میں غلط رسوم کی تردید ضرور کرتے ہیں۔ لیکن رسوم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ مولانا آزاد یہاں بھی ان کے بہت قریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں زندگی بلا مقصد بسر نہیں ہوسکتی، دل کے اٹکاؤ کے لیے کسی نہ کسی چیز کا ہونا ضروری ہے۔ عوام کی زندگی میں رسوم بڑی اہمیت رکھتی ہیں، وہ رسوم کو اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں جتنا کوئی صاحب بصیرت عقیدے اور مقصد کو عزیز رکھتا ہے۔ اس لیے عوام کی زندگی کو رسوم سے یکسر خالی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی غلط رسم عوام کی زندگی میں وجہ مفاسد بن گئی ہو اور اس کو ختم کرنا ہو تو یکسر اس کے خلاف جدوجہد کی بجائے یہ بہتر ہوگا کہ اس کے رُخ کو موڑا جائے، عوام کی زندگی سے کسی رسم کو بالکل نکال ڈالنا ممکن نہیں، اس قسم کی کوششوں میں کامیابی مشتبہ اور اس کے نتیجے میں اشتعال، منافرت، کشمکش اور بہت سے سماجی ومعاشرتی مسائل کا اٹھ کھڑا ہونا اور دیگر خرابیوں کا پیدا ہو جانا قطعی ولازمی ہوتا ہے۔ اس بارے میں مولانا آزاد اور مولانا سندھی دونوں کا نقطہ نظر ایک ہے، اس لیے کہ دونوں ایک ہی سرچشمہ یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم وافکار سے سیراب ہوئے ہیں، مولانا سندھی کے بارے میں تو

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ حضرتِ شاہ صاحب سے کس قدر متاثر ہیں۔ مولانا آزاد بھی صحیح مسلک کی طرف رہنمائی کرنی چاہتے ہیں تو مجدّدِ علوم و معارف اور معلّم و مربی اصحابِ استعداد، حضرت شاہ ولی اللہ کی تفہیمات کی طرف اسارہ کر دیتے ہیں، فرماتے ہیں:-

"جو رسوم و زوائد عوام کے مذہبی عقائد میں داخل ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم عوام کے جذبات کو مشتعل کریں اس سے اصلاح نہیں ہو سکتی اور نئی اجتماعی مضرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ چاہیے کہ نہایت صبر و تحمل سے کام لیا جائے، ان جذبات کو بلاضرورت ٹھیس نہ لگے، اشتعال انگیز صورت نہ ہو، فریقانہ نزاع کی شکل حتی الامکان پیدا نہ کی جائے، بیان میں سختی و گرمی نہیں ہونی چاہیے، بہتر یہ ہے کہ تعیّن و تسمیہ کے ساتھ رد و طعن بالکل نہ کی جائے عملاً ایسی فضا پیدا کرنی چاہیے، اور عملاً ایسے وسائل اختیار کرنے چاہییں کہ خود بخود ان اعمال کی شگفتگی اور رونق ماند پڑ جائے اور ان میں کشش و دل ربائی باقی نہ رہے۔ شاہ صاحب نے تفہیمات کی ایک تفہیم میں اپنی عادت کے مطابق اس کے مبادیات و اصول بتانے چاہے ہیں اور بہت قیمتی فوائد لکھے ہیں۔"[1]

بہت سے قومی و ملکی اور سیاسی و سماجی معاملات و مسائل میں مولانا سندھی کا جو تصور ہے وہ مولانا آزاد کے تصورات سے مختلف نہیں، ایک ہی تصور اور ایک ہی نظریہ ہے جس کا دو مختلف زبانوں سے اظہار ہو رہا ہے زیادہ سے زیادہ فرق ترتیبِ مقدمات یا تفصیلات میں یا اسلوبِ بیان میں ہو سکتا ہے، لیکن اندازِ فکر اور اصول میں کوئی فرق نہیں۔

ایک بڑی چیز دونوں کے یہاں عقیدے اور مسلک کا امتیاز ہے، مسلک سے میری مراد یہاں محض پالیسی اور کسی کام کے لیے مناسب طریقۂ کار سے ہے۔ وقتی مصالح اور ضروریات و حالات کے پیشِ نظر جو لائحۂ عمل بنایا جاتا ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم اور بعض اوقات اس کا ترک کرنا بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی کہ عقیدے سے روگردانی۔ لیکن اصولاً طریقۂ کار اور پالیسی کو کسی وقت بھی بدلا جا سکتا ہے، لیکن عقیدے کو جو حیثیت زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ پالیسی سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ عقیدہ کو نہ کسی طرح چھوڑا جا سکتا ہے نہ وقتی مصلحتوں کی

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۹۸

خاطر اور حالات کی سنگینی کی وجہ سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ طریقۂ کار اور پالیسی کو عقیدہ کی جگہ نہیں دی جاسکتی، مولانا سندھی فرماتے ہیں:

"وقتی مصالح، قومی رجحانات اور ملکی ضروریات کی حیثیت اپنی جگہ بالکل مسلّم ہے اور ان کی بنا پر جو قاعدے اور ضابطے بنتے ہیں، ان کی بھی زندگی میں بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن ان کو عالمگیر مذہب کے ارکانِ اصل بنا لینا غلطی ہے"[1]

اس کے بعد برصغیر پاک و ہند کی سیاسی زندگی سے ایک مثال دے کر اس اصول کی مزید وضاحت فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے موجودہ حالات میں زیرِ دست رعایا کے پاس حاکموں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لیے سوائے عدم تشدد کے اور کوئی حربہ نہیں اور اگر نہتّی رعایا تشدد پر اُتر بھی آئے تو اس کے پاس نہ تو تشدد کے ہتھیار ہیں اور نہ اس میں اتنی ہمت ہے کہ ان ہتھیاروں سے کام لے، اس لیے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ظلم کی مدافعت تو ضرور ہو، لیکن عدم تشدد کے ذریعے ہو، چنانچہ عدم تشدد کا یہ سیاسی مسلک ہندوستان کے خاص حالات اور پھر خاص زمانے کی ضرورتوں کا نتیجہ ہے، لیکن جب اس مسلک کے قائل ساری قوموں کو عدم تشدد کا اپدیش دیتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ عدم تشدد ہی عالمگیر صداقت کا اصلِ اصول ہے تو یہ ان کی زیادتی ہوتی ہے"[2]

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی تقاریر و تحاریر میں کئی جگہ ٹھیک انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے، انڈیا ونس فریڈم میں گاندھی جی سے اپنے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان کے لیے (گاندھی جی کے لیے) اصل معاملہ ہندوستان کی آزادی نہیں بلکہ پیسی فزم (PACIFISM) یعنی عدم تشدد پر مبنی امنِ عالم تھا۔ میں کھلم کھلا کہتا تھا کہ کانگریس پیسی فسٹ ادارہ (PACIFIST ORGANIZATION) نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرانا ہے" (صفحہ ۴۳)

---

[1] مولانا عبید اللہ سندھی، از پروفیسر محمد سرور صاحب۔

[2] مولانا عبید اللہ سندھی۔ از پروفیسر محمد سرور صاحب صفحہ ۲۵۸

اس سلسلے میں مزید فرماتے ہیں :

"میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا مگر اپنے آپ کو ان سے (گاندھی جی سے) اتفاق کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ میرے لیے عدم تشدد مصلحت کی بات تھی، عقیدے کی نہ تھی، میری رائے تھی کہ اگر کوئی چارہ نہ ہوتا تو ہندوستانیوں کو اس کا حق تھا کہ تلوار سے کام لیں۔ لیکن پُرامن طریقوں سے آزادی حاصل کرنے میں عظمت و شرافت زیادہ تھی۔ اور بہر حال ملک کی جو حالت تھی اسے دیکھتے ہوئے گاندھی جی کا مسلک صحیح تھا" (صفحہ ۴۴)

مولانا اسے صرف اس لیے اختیار کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے موقتہ سیاسی حالات میں وہ صحیح طریقہ کار تھا نہ کہ صحیح عقیدہ ! فرماتے ہیں :

"عدم تشدد ہندوستان کو آزاد کرانے کا صحیح طریقہ ہے اور اسے قائم رکھنا لازمی ہے" (صفحہ ۴۴)

جس طرح دونوں بزرگ رہنما عقیدہ اور مسلک میں فرق کرتے ہیں اسی طرح دونوں بزرگ "اصل وتعبیر" کی تفریق میں بھی متحد الفکر نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد نے یہود ونصاریٰ اور دنیا کی بہت سی گمراہیوں کی بنیاد اصل وتعبیر میں عدم تفریق و امتیاز کو قرار دیا ہے۔ یعنی گمراہی یہ نہ تھی کہ اصلاً حقیقت ان کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئی تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ اصل وتعبیر کے فرق و امتیاز کو انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا اور حقائق کی تعبیرات و تمثیلات کو اصل سمجھ لیا تھا، اس پر جس قدر زمانہ گزرتا گیا گمراہیاں بڑھتی گئیں اور اختلافات زیادہ ہوتے گئے۔ اس سے ایک اور حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اختلافِ مذاہب دور کرنے اور کسی ایک ہی حقیقت کا والہ و شیدا بنانے کے لیے یہ طریقہ ہرگز سود مند نہیں ہو سکتا کہ کسی مذہب کا یکسر انکار اور کلیۃً تردید کی جائے، بلکہ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ مذہب کی اصل و حقیقت سے پردے ہٹائے جائیں اور تعبیرات کی بھول بھلیوں سے اہل مذہب کو نکالا جائے یہ مذہب اور انسانیت دونوں کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ جس روز اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے اور دنیا اس حقیقت کو پالے گی جس کی طرف تمام ہادیانِ کرام نے انسانوں کو بلایا تھا اور جس کو "الاسلام" کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دونوں بزرگ معاملات ومسائل پر صرف منطقی اور نظری اعتبار ہی سے غور و فکر نہیں کرتے

بلکہ وہ کسی مسئلے کے عملی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔ اس طرح دونوں کے افکار کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان کو عملی سانچوں میں ڈھالا جائے تو ان کی شکل میں ادنیٰ تغیر نہ ہوگا۔ ان کے افکار کی یہ خصوصیت اس لیے بھی ہے کہ وہ محض عالم اور مفکر ہی نہ تھے۔ عملی آدمی بھی تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی مذہبی سیاسی زندگی میں کئی ایسے بزرگوں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کی تحریریں فکری و نظری اور منطقی استدلال کے لحاظ سے بڑی خوشنما نظر آتی ہیں اور ذہن و دماغ ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں لیکن اگر ان خیالات کو عمل میں لانے اور ان کے مطابق معاشرہ اور سیاسی زندگی کی تعمیر کی کوشش کی جائے تو پوری کامیابی ممکن نہ ہوگی یا وہ خیالات اپنی خوشنمائی اور دل ربائی کھو بیٹھیں گے یہ ساری خرابی مسئلے کے عملی پہلو کو نظر انداز کر کے سوچنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس قسم کی تحریک کو منطقی، کلامی، کتابی یا روحانی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تحریک کا کسی فکری و نظری تحریک سے تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے، اور بلاشبہ اس کی اپنی جگہ پر اہمیت اور افادیت بھی ہے۔ لیکن عملی اور انقلابی تحریک کے مقابلے میں کوئی ایسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، اس دنیائے عمل و انقلاب میں مسائل و معاملات کو صرف منطق و کلام سے طے نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ہمارے لیے مفید اندازِ فکر مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد ہی کا ہو سکتا ہے۔

دونوں بزرگ تعصب سے پاک۔ دونوں میں ہمہ گیر وسعتِ قلبی، دونوں ساری انسانیت کو آغوشِ محبت میں چھپا لینے کا جذبہ رکھتے ہیں، دونوں وحدتِ انسانیت اور عالمی انسانی برادری کے قیام کے داعی ہیں، حالانکہ ہمارے یہاں بہت سے علماء وحدتِ انسانیت اور عالمی انسانی برادری کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں۔

افکار و خیالات اور اندازِ فکر کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آتے ہیں، اس کے باوجود دونوں کی اپنی مستقل شخصیتیں ہیں، دونوں کی خصوصیات جدا بھی ہیں۔ مثلاً ابوالکلام آزاد ایک داعی و خطیب ہیں تو مولانا عبیداللہ سندھی معلم و مدرس ہیں، مولانا آزاد کی تحریر سے جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے تو مولانا سندھی کی تحریر سے فکر کو جِلا ملتی ہے۔ ابوالکلام کی تحریر مقصد کا عشق پیدا کر کے منزلِ دار و رسن پہ دوڑا دیتی ہے، سندھی کی تحریر سے ہم اس راہ پر گام فرمائی کی بجائے، افکار میں کھو جاتے ہیں۔ ابوالکلام کی تحریر ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ سندھی کی تحریر فکر انگیز ہوتی ہے۔ مولانا آزاد ایک بات کو لیتے ہیں، اس کو سمجھاتے ہیں، اس کی اہمیت واضح کرتے ہیں اور

دل میں اس کا عشق پیدا کر کے جذبۂ عمل کو بیدار کر دیتے ہیں، مولانا سندھی کی فکر بعض اوقات واضح نہیں ہوتی، غور و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے، جذبہ بیدار ضرور ہوتا ہے، لیکن جوشِ عمل و حرکت پیدا نہیں ہوتا۔ ابوالکلام عمل سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لیے امام ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبل وغیرہ ان کے ممدوح ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے مقابلے میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا تذکرہ انھوں نے زیادہ والہانہ انداز میں کیا ہے، اُن کے نزدیک اصل چیز عمل اور استقامت و عزیمت ہے لیکن مولانا عبید اللہ سندھی فکر پر جان دیتے ہیں اس لیے حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کے مقابلے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ ان کا مرکزِ عقیدت ہیں۔ مولانا آزاد میں مولانا سندھی کے مقابلے میں انانیت و خودپرستی زیادہ ہے، اس لیے انھوں نے اپنی شخصیت کو کہیں فنا نہیں ہونے دیا۔ حضرتِ شاہ ولی اللہؒ کے افکار اور ان کے مسلک سے وہ بہت متاثر ہیں لیکن ان کے مسلک کا بظاہر تتبعؔ اور ان کے افکار میں خود کو فنا نہیں کیا، ان کے افکار کو اپنی شخصیت میں رچا بسا لیا ہے، ان کے مقابلے میں مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرتِ شاہ صاحب کے افکار میں خود کو فنا کر دیا ہے۔ مولانا آزاد کا مذہب عشق اور مولانا سندھی کا مذہب عقل ہے ــــــ لیکن جس طرح مولانا آزاد کا مذہبِ عشق عقلی ہے اسی طرح مولانا سندھی کو اپنے مذہبِ عقل سے عشق ہے ــــــ !!

حضرت انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا آزادؒ

مولوی عبدالرحمٰن کوندو

۱۹۱۸ء کے بعد جب کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن ابھی مالٹا میں نظر بند تھے۔ اور مولانا آزاد و علی برادران اور دیگر مجاہدین حریت ہندوستان کے جیل خانوں میں اسارت کے دن گزار رہے تھے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے جلیانوالا باغ کے قتل عام اور پنجاب میں مارشل لا وغیرہ کے واقعات نے ملک بھر میں زلزلہ ڈال کر ہر حساس دل کو سربکف ہو جانے پر اکسایا جس سے کانگریس میں نئی جان پڑی اور اس کی اعانت کے لیے مجلسِ خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند جیسی تنظیمیں معرض وجود میں آئیں[1]، جنہوں نے مسلمانانِ ہند خاص کر مسلمانوں کے علماء کو جد و جہد آزادی کی صف اوّل میں لا کھڑا کیا۔ مجلس خلافت سے بھی زیادہ جس تنظیم نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے ذہین ترین عنصر کو ایک دوسرے سے متعارف و متعاون کرانے میں مؤثر حصہ لیا وہ جمعیۃ العلماء ہند تھی۔ اس تنظیم کے پہلے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی تھے۔ اس کا دوسرا اجلاس[2] جو لاہور میں منعقد ہوا اس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ اسی طرح جمعیت کا ایک اور اجلاس کلکتہ میں ہوا اور اس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کی اور تمام حریت نواز علما کی طرح حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری بھی جمعیۃ العلماء ہند کی صفِ اوّل کے رہنما تھے اور جمعیۃ العلماء جو اپنے طریق کار کو کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے منہاج کے مطابق رکھنے کی مدعی تھی اس کو قدم قدم پر حضرت شاہ صاحب کے فیوض سے استفادہ کرنا پڑتا تھا۔ اور ۱۹۲۷ء میں تو جمعیۃ العلماء کے پشاور والے اجلاس

---

[1] - مجلس خلافت ان واقعات سے پہلے قائم ہو چکی تھی جمعیت علماء کا قیام دسمبر ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر عمل میں آیا دونوں جماعتیں انقلاب پسند اور آزادی خواہ تھیں ملک کی آزادی کی تحریک میں دونوں نے سرگرم حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ میں دونوں نے کانگریس سے تعاون کیا لیکن ان میں کسی کے بھی معرض وجود میں آنے کا مقصد کانگریس کی اعانت نہ تھا۔ دونوں کے قیام مقاصد کے الگ دائرے تھے۔ (ا۔ س)

[2] - مولانا آزاد کی صدارت میں جمعیت علما ہند کا اجلاس بمقام لاہور تیسرا اجلاس تھا، نہ کہ دوسرا۔ (ا۔ س)

میں جب آزادی کامل اور انگریزی راج کے خاتمہ کو جمعیت نے اپنا نصب العین قرار دیا تو اس وقت جمعیت کے سالانہ اجلاس کے صدر حضرت شاہ صاحب ہی تھے اور اس اجلاس میں حضرت شاہ صاحب نے وہ تاریخی خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جو جمعیۃ العلماء کے خطبات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی تازگی افکار و خیالات آج بھی مفکرین و مدبرین سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہے۔

یہ تمہیدی کلمات عرض کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور مولانا آزاد جمعیۃ العلماء ہند جیسی عظیم الشان تنظیم کے ساتھ اس کے ابتدائی دور سے وابستہ چلے آتے تھے اور جمعیت کی مجالس میں اکثر و بیشتر لازماً و فطرۃً باہم ملتے تھے اور اس دوران نہ معلوم آپ علمی رموز و دقائق کی کن کن گتھیوں کو بھی سلجھاتے ہوں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق مولانا آزاد مرحوم کیا رائے رکھتے تھے اور آپ کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کے کس قدر معترف اور قدر دان تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ کلکتہ میں مولانا آزاد نے جو دینی مدرسہ قائم کیا تھا اس میں اونچے علوم کے شائقین کا جب ہجوم ہو گیا تو درس حدیث دینے کے لیے مولانا آزاد حضرت شاہ صاحب کو بلانے پر مُصر ہوئے چنانچہ آپ نے براہِ راست حضرت شیخ الہندؒ سے یہ مطالبہ کیا کہ کلکتہ کے مدرسہ کے لیے مولانا انور شاہ کی خدمات عطا کی جائیں، مگر مولانا آزاد اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس کی وضاحت حضرت مولانا مدنی کی کتاب "نقش حیات" کے حسب ذیل اقتباس سے ہو جاتی ہے:

"حضرت (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کے قیام دہلی کے زمانہ میں مولانا عبد اللہ مصری جو کہ دراصل الٰہ آباد کے باشندے ہیں، اور مصر میں عرصہ تک ایام طالب علمی میں اقامت کرنے کی وجہ سے مصری مشہور ہو گئے ہیں۔ جناب مولانا ابو الکلام صاحب کے بھیجے ہوئے کلکتہ سے تشریف لائے اور مولانا موصوف کا خط لائے جس میں یہ مطالبہ تھا کہ چونکہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلبہ نے ترک موالات تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی کر لی ہے اور چاہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کر دیا جائے، خلافت کمیٹی کے اراکین اس کی سرپرستی کریں اس لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا مدرس جو کہ علم حدیث کی کتابیں پڑھا سکے، جلد بھیج دیا جائے تاکہ وہ اوپر کے طلبہ کو پڑھا سکے اور مشہور و معروف ہو، خلافت کمیٹی اس کی کفالت کرے گی، ضرورت ہے کہ مولانا

انور شاہ صاحب کو یہاں بھیج دیں۔

حضرتؒ نے کہا کہ شاہ صاحب (مرحوم) تو دارالعلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو کہ تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور اس کو تجربہ اور شہرت حاصل ہو۔"[۵۱]

مرد مجاہد مولانا مدنیؒ مرحوم کے متذکرہ صدر بیان سے بیک وقت دو اہم باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ مولانا آزاد مدرسہ اسلامیہ کلکتہ[۵۲] کے لیے حضرت شاہ صاحب کو سب پر ترجیح دیتے تھے۔ لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا آزاد حضرت شاہ صاحب کی علمی صلاحیتوں کے معترف اور جوہروں کے شناسا تھے۔

دوم اس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۵ئہ میں سفر حجاز پر روانہ ہونے کے وقت جس طرح حضرت شاہ صاحب کو اپنی جانشینی کے لیے منتخب کیا تھا ۱۹۲۰ئہ میں اپنی وفات سے قبل بھی اسی طرح اپنی جانشینی کے قابل صرف آپ ہی کی ذات کو یقین کرتے تھے اسی لیے تو حضرت ممدوح نے فرمایا کہ "شاہ صاحب تو دارالعلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے۔" اللہ اللہ! ایک طرف امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا مطالبہ اور دوسری طرف حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ کا انتخاب جانشینی۔ سچ ہے ؎

اِنَّمَا یَعْرِفُ ذَاالْفَضْلِ مِنَ النَّاسِ ذَوُوْہُ

مولانا آزاد کو حضرت شاہ صاحب سے جو تعلق ابتدا میں علمی قدر دانی کی شکل میں تھا وہ روز بروز بڑھتا گیا اور شاہ صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں اس تعلق نے ایک قسم کی عقیدت کی صورت اختیار کر لی تھی چنانچہ ایسے اکابر علما اور دونوں بزرگوں کے عقیدتمند اور مرتبہ دان دہلی میں کل تک زندہ تھے۔ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک بار حضرت شاہ صاحب مدرسہ امینیہ دہلی میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے مہمان کے طور سے ٹھہرے ہوئے ہیں مولانا آزاد شوق ملاقات میں وارد مدرسہ ہوتے

---

[۵۱] ۔ ملاحظہ ہو نقش حیات جلد دوم ص۱۶۱، ۱۶۲

[۵۲] ۔ یہ مدرسہ کلکتہ کی ناخدا مسجد میں قائم ہوگیا تھا اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اسکے ناظم بنائے گئے تھے۔

ہیں اور بے تکلف آپ کے سامنے مؤدبانہ دوزانو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اس ہیئت کذائی کو کب گوارا کرتے ہوتا ہم اس واقعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی حقیقت بین نگاہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی عبقریت ہی نہیں بلکہ آپ کی روحانی فضیلت کا بھی پورا پورا اندازہ کر لیا تھا اور اپنے غیر معمولی طرزِ عمل سے اس کا اعتراف کر رہے تھے۔

مولٰینا سید احمد رضا صاحب بجنوری کے بیان کے مطابق آخری دور میں حضرت شاہ صاحب جب کبھی دیوبند سے ڈابھیل اور ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے تو آپ کا معمول تھا کہ دہلی میں اپنے اوّلین رفیق اور خواجہ تاش مولانا کفایت اللہ صاحب سے مدرسہ امینیہ دہلی (کشمیری گیٹ) میں ملاقات کرتے اور ان مواقع پر مولانا کفایت اللہ صاحب مولانا آزاد کو بھی آگاہ کر دیتے تھے اور مولانا ایک دم امینیہ چلے آتے اور حضرت شاہ صاحب سے ملتے (اس صحبت پر ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے بھی رشک کرتے)۔ حضرت شاہ صاحب کا مطالعہ چونکہ بہت وسیع تھا، لہٰذا مولانا آزاد ان سے نوادر کے حوالے بھی پوچھتے تھے[۱] اور چونکہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تحریرات میں متعدد بار یہ شعر نقل کرتے آئے ہیں کہ:۔

ہیچگہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

جب حضرتِ موصوف کا یہ حال تھا کہ بے پناہ علم و فضل کے مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے سے کمتر درجے کے علماء سے بھی استفادہ کرنے کی جستجو میں رہتے تھے تو حضرت شاہ صاحب جیسے فنا فی العلم کا استفادہ کرنا کوئی ناممکن امر نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد رشید مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ تعالیٰ نے دونوں بزرگوں کے تعلقات پر یہ کہہ کر روشنی ڈالی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد حضرت شاہ صاحبؒ کی وسعتِ علم اور حذاقتِ فنِ حدیث کے پوری طرح معترف و مقر تھے اور حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ حال تھا کہ جب مولانا آزاد کی تفسیر قرآن (ترجمان القرآن) شائع ہوئی تو حضرت شاہ صاحب نے بحیثیتِ مجموعی ان کے اس علمی کارنامہ کی تعریف کی۔"

---

[۱] مکتوبِ گرامی مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری (بنام راقم الحروف) مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۷۵ء (دونوں)

استدراک

ابوسلمان شاہجہاں پوری

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کا پیمانۂ علم وسیرت اس سے بہت بلند ہے، جتنا کہ جناب عبدالرحمٰن کوندو کی اس تالیف "الانور" سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور مولانا آزاد کے تذکرے میں جس مقام پر کوندو صاحب نے قلم کو روک لیا ہے، حضرت شاہ صاحب کے "رابطہ" اخلاص ومحبت کی دل ربائیاں اس سے بہت زیادہ ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ازسرِنو تالیف مطالب کی سعی کی جائے اس لیے اتنے ہی بیان پر اکتفا کر لینا چاہیے۔ لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے ذوقِ علمی، شوقِ مطالعہ، وسعتِ علم، بلندیٔ فکر، قوتِ حافظہ، تیزیٔ طبع، درّاکیٔ ذہن اور اپنی ذکاوت اور ذہانت وفطانت میں اگر کوئی مولانا آزاد کا واقعی ہم رتبہ معاصر تھا تو وہ حضرت کشمیری کی ذات گرامی تھی۔

حضرت شاہ صاحب اگرچہ سیاسی آدمی نہ تھے لیکن وہ سیاسی شعور سے ناآشنا بھی نہ تھے۔ چنانچہ وہ زندگی بھر ملک کی انقلابی اور ترقی پسند سیاسی قوتوں کے حق میں مخلص رہے لیکن اپنے دائرۂ عمل کو دیوبند کی انقلابی سیاست اور جمعیت علمائے ہند کی فکری رہنمائی تک محدود رکھا۔ دیوبند کے حلقے میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد وہ مولانا آزاد کے سب سے بڑے قدردان اور مولانا کے علم وسیرت کے سب سے زیادہ قائل تھے وہ وقت کی ایک نبّاض شخصیت اور مولانا آزاد کے مخلصین میں سے تھے۔

جمعیت علمائے ہند کے اجلاسِ لاہور (۱۹۲۱ء) کے موقع پر تقریر میں حضرت شاہ صاحب نے مولانا آزاد ہی کو امام الہند کے منصب کا اہل قرار دیا تھا۔ ان کا شمار ان اصحابِ بصیرت میں ہوتا تھا جو ہندوستان میں نظمِ جماعت کے قیام کے لیے بے چین تھے اور جن کے نزدیک مسلمانوں میں نظم واجتماع کا قیام خواہ کسی درجے میں ہوتا، بہ ہر صورت مفید تھا۔

حضرت انور شاہ مولانا آزاد کے علم کی وسعت، ذہن کی درّاکی، مسائل کے فہم وبصیرت کے قائل تھے اور انہیں "اذکی الناس" فرماتے تھے۔ وہ اگرچہ عمر میں مولانا سے تیرہ برس

بڑے تھے۔ لیکن ہمیشہ مولانا کی صحبت و ملاقات کے متمنی رہتے تھے۔ مولانا آزاد بھی ان کا حد درجے احترام فرماتے تھے مولانا بڑے بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور مخصوص حضرات کے سوا کبھی کسی سے ملاقات کے لیے نہیں جاتے تھے، حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ہمیشہ خود حاضر ہونا پسند فرماتے تھے اور اگرچہ ملاقات میں وہ ہر کسی سے اسلامی اخلاق و تواضع سے پیش آتے تھے لیکن حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں تو وہ کمال اخلاق، حسن تواضع اور عجز و انکسار کا حیرت انگیز و دلاویز نمونہ پیش فرماتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ہمیشہ دو زانو بیٹھتے تھے اور ٹوپی اوڑھے رہتے تھے۔

مولانا آزاد حضرت شاہ صاحب کے علم کی وسعت، مطالعے کے ذوق، فراست کے کمال، حافظے کی قوت۔ اور ذہن و دماغ کی صلاحیتوں کے بہت معترف تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا آزاد سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے جس میں مولانا رح نے حضرت شاہ صاحب کو ہندوستان کا آخری محدث قرار دیا تھا ان کے بعد سرزمین ہند سے اس پایے کا محدث پیدا نہیں ہوا۔ وہ حدیث کے فن میں غیر معمولی درک و بصیرت اور متونِ حدیث پر تحقیقی و تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ مولانا کے نزدیک حضرت شاہ صاحب حدیث کے ایک کامل الفن استاد تھے۔

ابوالکلام آزاد
اور
نواب صدر یار جنگ بہادر کے تعلقات

ڈاکٹر ریاض الرحمان شروانی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے تعلقات سے عام طور لوگ غبار خاطر کی اشاعت سے پہلے بہت کم واقف تھے۔ ان دونوں کی زندگی کے حالات و واردات میں جو تفاوت تھا اس کے پیش نظر ایسا ہونا قدرتی تھا۔ مولانا کی زندگی کا سب سے اہم داعیہ جہاد حریت کی گرم بازاری تھا جب کہ نواب صاحب خاموش اور پرسکون زندگی کے شیدائی تھے۔ نتیجے میں ایک کے شب و روز کا کافی بڑا حصہ قید خانے کی چار دیواری میں گزرا تو دوسرے کا ریاست حیدر آباد کی مسند وزارت پر، لیکن دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک ایسی تھی جو دوسرے اختلافات پر حاوی رہی اور جس نے زندگی بھر کی ذہنی رفاقت اور قلبی تعلق کی صورت اختیار کر لی۔ یہ قدر مشترک علمی ذوق اور ثقافتی ہم آہنگی تھی۔ دونوں کو فارسی شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور دونوں اپنے اپنے طور پر اسلامی ثقافت اور روایات کے بہترین نمایندے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا آزاد پر ایک مقالے میں بڑی خوش اسلوبی سے ثابت کیا ہے کہ ان کی شخصیت کی تکمیل میں سب سے زیادہ حصہ ان ہی دو اجزا کا تھا میرے خیال سے یہی بات نواب صدر یار جنگ پر صادق آتی ہے۔ زندگی کے آخری دور تک پہنچنے پر دونوں کو یہ احساس بھی شدت سے ہو گیا تھا کہ اب وہ سانچے ہی باقی نہیں رہے جن میں ان جیسے لوگ ڈھلا کرتے تھے اور اس لیے دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب آ گئے تھے۔ "کاروانِ خیال" میں مولانا آزاد کا پہلا خط ۱۱ ستمبر ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اسی خط سے "مراسلت جبین" کے اس سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جو "کاروانِ خیال" اور "غبارِ خاطر" کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اس خط میں مولانا آزاد، اختلافِ طبائع کے باوجود اشتراکِ ذوق پر اس طرح روشنی

ڈالتے ہیں :

"میں نظر بندی سے چھوٹا تھا، آپ حیدر آباد سے آئے تھے۔ دونوں جہتوں میں بعد المشرقین تھا مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود — ز زہد ہمچو توئی یا بہ فسق ہمچو منی"

اسی خط میں گزری ہوئی صحبتوں اور بدلے ہوئے حالات کا ماتم اس طرح ملتا ہے:

"افسوس، جتنے ہم نفس تھے ایک ایک کرکے سب رخصت ہو گئے، وہ صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں اب برسوں گزر جاتے ہیں، ایک متنفس نظر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق و طبیعت کی دو چار باتیں کر لوں۔ اب نہ زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمل ہے، نہ ہم زمانے کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں۔"

اسی مجموعے کے ایک اور خط میں رقم طراز ہیں :

"اب وہ وقت آگیا کہ ان تذکروں کے لیے بھی کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ کہاں جائیے اور کس سے باتیں کیجیے۔ جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہو گئے! ہاں الحمد للہ ایک آپ کی ذاتِ گرامی باقی ہے لیکن یک جائی میسر نہیں۔

سراغ یک نگاہِ آشنا در کس نمی یابم — جہاں چوں نرگستان بے تو چشم کور می ماند"

اور وہ تذکرے کون سے تھے جن کے لیے "کوئی مخاطب نہیں ملتا" تھا؟ وہی فارسی شعر و ادب کی باتیں اور شعرا و ادبا کے تذکرے۔ یہ موضوع اس مراسلت میں بار بار آیا ہے اور دونوں طرف سے بڑے جوش و انہماک سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً نواب صدر یار جنگ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

"فارسی ادب کا ذوق کھونے سے ملک نے بڑی نعمت کھو دی۔ کیا جاں فزا ادب تھا!"

مولانا آزاد زندگی کے آخری برسوں میں بڑی حد تک جائے بند ہو گئے تھے۔ اس کی عجیب عجیب توجیہیں کی گئیں، مخالفوں نے اپنے طریقے سے کیں اور ہم دردوں اور عقیدت مندوں نے اپنے طور پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کی تنہائی پسندی کا سراغ سب سے زیادہ ان کے اسی احساس میں ملتا ہے کہ وہ جس ماحول میں زندگی گزار رہے تھے وہاں انھیں

اپنے "ذہن وطبیعت" کا کوئی انسان نہیں ملتا تھا۔ بہر حال یہ دوسرا موضوع ہے جس پر لکھنے کا یہ موقع نہیں۔

نواب صاحب اور مولانا کی "پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی" جب مولانا "الندوہ کی ایڈیٹری کے سلسلے میں وہاں مقیم" تھے "یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے"۔ (کاروانِ خیال ص ۷۰ مکتوب مولانا آزاد بنام نواب صاحب) ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی نعمانی کی ذات تھی جن سے دونوں کو یکساں عقیدت تھی۔ اس وقت نواب صاحب کی عمر ۳۹ سال تھی اور مولانا کی ۱۷ سال۔ دونوں کی عمر میں تقریباً" ایک نسل کا تفاوت تھا لیکن عمروں کا یہ تفاوت رشتۂ موانست قائم ہونے میں مانع نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کی عبقریت نے انھیں وقت سے پہلے ہی عمر رسیدہ بنا دیا تھا اور ان کے تعلقات تقریباً" ایک نسل اوپر ہی کے لوگوں سے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی شہادت یہ کہہ کر دی ہے کہ جب وہ انگلستان سے تعلیم مکمل کر کے ہندوستان آئے تو کانگرس کی مجلس عاملہ کے جلسوں میں دور سے دیکھتے تھے کہ بزرگوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی شریک ہوتا تھا اور یہ دیکھ کر انہیں حیرت ہوتی تھی۔ لیکن جب کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اس نوجوان کو قریب سے دیکھا تو محسوس کیا کہ "اس کے جوان کندھوں پر بوڑھا سر رکھا ہوا تھا"۔ یہ نوجوان مولانا آزاد ہی تھے۔ اس کے بعد نواب صاحب اور مولانا کی ملاقاتوں کا سلسلہ وقفوں کے ساتھ ۱۵ برس تک جاری رہا۔ اس سلسلے کی آخری ملاقات، مولانا ہی کے الفاظ میں "۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب مرحوم (مراد حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے ہے) کے یہاں دہلی میں" ہوئی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان ۲۰ سال کی مدت ہے۔ اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ اس طویل عرصے میں خط و کتابت بھی ہوئی ہو۔ لیکن وقت کے اس فاصلے کے باوجود قلبی تعلق اسی طرح قائم رہا اور جب ستمبر ۱۹۴۰ء میں "الماریوں میں ایک کتاب ڈھونڈتے ہوئے الندوہ کے بعض رسائل کا مجموعہ" مولانا کے ہاتھ آیا تو "ذہن ندوہ کی صحبتوں کی طرف منتقل" ہو گیا اور پھر اچانک "نواب صاحب" یاد آ گئے" اور مولانا نے انھیں خط لکھ ڈالا اور اس طرح مراسلت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے "کاروانِ خیال" اور "غبارِ خاطر" کی صورت میں اہل ذوق کی سیرابی کا سامان مہیا کیا۔ تعلقات کے اس استحکام سے ان دونوں کی استقامت اور مستقل مزاجی پر بہت خوش گوار روشنی پڑتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کبھی درمیان میں باہمی اختلافات کی خلیج نہ

حائل ہوئی ہو۔ ایسا وقت بھی آیا لیکن دونوں کی سلامت روی اختلافات کی خلیج پر پل بن گئی اور تعلقات کی ریشمی ڈور بدستور جڑی رہی۔ عدم تعاون کی تحریک کے اثرات علی گڑھ کالج میں بھی پہنچے اور کالج کے بعض سپوتوں نے جذبۂ آزادی کی گرمی اپنے سینوں میں محسوس کی۔ قومی رہ نماؤں نے انہیں اس طرف دعوت دی جن میں مہاتما گاندھی، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد پیش پیش تھے۔ نواب صاحب طبعاً سیاسی ہنگاموں کو ناپسند فرماتے تھے اور ان کی ایمان داری سے رائے تھی کہ اس تحریک میں شرکت کالج کے مفاد میں نہیں ہے اس لیے انہوں نے اس کی مخالفت فرمائی۔ "اسٹریچی ہال" میں جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی نے تحریک میں طلبہ کی شرکت کی حمایت میں اور نواب صاحب نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں۔ قومی رہ نماؤں کا قیام اولڈ بوائز لاج میں تھا۔ مولانا آزاد بھی وہیں مقیم تھے۔ شام کو نواب صاحب ان سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ملاقات ہوئی اور اسی خوش دلی اور گرم جوشی سے ہوئی جیسی ہمیشہ ہوتی تھی۔ علمی نوادر پر گفتگو ہونے لگی۔ مولانا محمد علی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ دونوں دوست محوِ گفتگو ہیں۔ زود رنج آدمی تو تھے ہی ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہا "آج کل عدم تعاون کے علاوہ کوئی نادر چیز نہیں ہے" نواب صاحب کو ثقل سماعت تھا اس لیے انہوں نے ان کا یہ جملہ نہیں سنا لیکن مولانا آزاد نے سن لیا اور جواب دیا "جی نہیں، نواب صاحب کا اور میرا یہ میدان نہیں ہے، ہمارا میدان دوسرا ہے۔" نواب صاحب کے غیر سیاسی میلان کا مولانا آزاد کو کس قدر پاس تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب قلعہ احمد نگر کے ایک مکتوب میں غیر ارادی طور پر وقت کے بعض سیاسی حالات و واردات کا ذکر آ جاتا ہے تو فوراً موضوع بدلتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کیلیے نہیں ہوا کرتی، از راہ بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس، میری دکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں تاکہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔"

یہی رویہ مولانا کے بارے میں نواب صاحب کا بھی تھا۔ مجھے خوب یاد ہے "غبار خاطر" حال ہی میں چھپ کر آئی تھی نواب صاحب ایک مجلس میں بڑے لطف سے مولانا کی علمی قابلیت

اور ادبی صلاحیت کا ذکر فرما رہے تھے۔ مسلم لیگی سیاست کا بحرانی دور تھا ایک صاحب زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکے اور مولانا کے سیاسی افکار و اعمال پر اعتراض کر بیٹھے۔ نواب صاحب نے ناگواری سے فرمایا:

"ہمارا یہ میدان نہیں ہے، ہم بالکل دوسرے ابوالکلام سے واقف ہیں۔"

"غبارِ خاطر" کے پیش لفظ میں پروفیسر محمد اجمل خان نے مولانا کے بارے میں لکھا ہے "جن دوستوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ ہے، وہ ان کے علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں اور اس طرح رکھتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی۔ نہ تو کبھی وہ ان دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کے آلام و مصائب میں شریک ہوں، نہ کبھی اس کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار و اعمال سے اتفاق کریں۔" اسی طرح نواب صدر یار جنگ کی وفات پر مسلم یونیورسٹی میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

"مرحوم نے اپنے احول کے خلاف اپنے لیے ایک راہ متعین کی اور اس پر چل پڑے... انھوں نے اپنے لیے ایک راہ تجویز کر لی تھی لیکن وہ دوسروں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔"

دونوں بزرگوں کی طبیعت کا یہی رجحان تھا جس کی بدولت بعض معاملات میں اختلافِ مسالک کے باوجود آخر وقت تک دوستانہ روابط استوار رہ سکے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، نواب صاحب اور مولانا آزاد کا سب سے زیادہ مابہ الاشتراک علمی و ادبی ذوق کا رشتہ تھا۔ اس لیے ان کی ملاقاتوں میں گفتگو کا بیشتر موضوع یہی ہوتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: "آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے۔ اسی کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی۔" لیکن یہ سوچنا درست نہیں ہوگا کہ ان ملاقاتوں میں ظرافت و تفریح کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ نواب صاحب کے مصاحبِ خاص حاجی ملا احمد تھے۔ مولانا کو بھی ان سے دلچسپی تھی۔ لکھنؤ میں ایک دفعہ مولانا کو بخار آیا، اور انھوں نے کونین استعمال کی۔ کونین کے خلاف اس وقت قدیم خیال کے لوگوں میں بہت تعصب تھا ملا صاحب بھی اسی خیال کے تھے۔ اس وقت جو کیفیت ہوئی اس کا حال خود مولانا کے الفاظ میں سنیے۔ ملا صاحب کو یاد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"معلوم نہیں ملّا صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا کیا حال ہے ؟ ان کا کونین کو "کُونَیَن"
بروزنِ زَدَجَین کہنا اس وقت بھی دماغ میں گونج رہا ہے۔ آپ کو موقع یاد
آیا ؟ جلسۂ زندہ کے موقع پر جب مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم کے یہاں
ٹھہرے ہوئے تھے اور مجھے بخار آیا تھا۔ میں نے کونین کی مقدار بڑھائی
شروع کی اور ملّا صاحب نے اس کے مثالب و قبائح پر مسلسل لیکچر دینا شروع
کر دیا۔ افسوس اب ان صحبتوں کی صرف یاد باقی رہ گئی۔"

اس کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا:

ملّا صاحب سلامِ شوق پیش کرتے ہیں اور کُونَیَن بروزنِ زَدَجَین کے ذکر میں دوسرا
جزو بڑھاتے ہیں کہ دو بجے شب کو دودھ لانے کا حکم ہوا تھا، تعمیل ہوئی تھی۔"

مولانا نے اس واقعے کی تصدیق یہ لکھ کر فرمائی:

"ملّا صاحب کے سلامِ شوق سے بہت جی خوش ہوا۔ میرا بھی سلام انھیں
پہنچایئے اور ان کے حافظے کی داد دیجیے۔"

انھیں ملّا صاحب کے ساتھ مولانا کی بے تکلفی اور لطف کا مشاہدہ بعض لوگوں نے اس
وقت کیا جب مولانا ۱۹۴۹ء کے شروع میں بہ حیثیت وزیرِ تعلیم حکومتِ ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے سالانہ کانووکیشن کو خطاب کرنے کے لیے تشریف لائے اور اپنے "صدیقِ مکرم" کے
ساتھ چند لمحے گزارنے کے لیے ان کے مکان "حبیب منزل" میں قدم رنجہ فرمایا۔ مولانا کے
بعض عقیدت مند چاہتے تھے کہ نواب صاحب کے ساتھ ان کا فوٹو لیں۔ مگر کسی کو یہ عرض کرنے
کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے ملّا صاحب کو اس کام کے لیے تاکا اور وہ فوراً راضی ہو
گئے۔ ڈرائنگ روم میں جا کر مولانا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ آئیے ذرا باہر تشریف لایئے۔ مولانا
پوچھتے ہی رہے کہ کیا بات ہے اور انھوں نے باہر لا کر کھڑا کر دیا۔ ساتھ میں نواب صاحب
بھی باہر تشریف لے آئے۔ جب مولانا کو صورتِ حال کا احساس ہوا تو بہت لطف لیا اور
بڑی خوش دلی سے فوٹو اتروایا۔

بعض شخصیتیں ایسی تھیں جن سے نواب صاحب اور مولانا کو یکساں تعلقِ خاطر تھا۔ ان
میں سب سے پہلی ذات علامہ شبلی نعمانی کی تھی۔ ان کا ذکر دونوں نے بڑے والہانہ انداز میں
اور لطف کے ساتھ کیا ہے۔ نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا شبلی پر خدا کی رحمت۔ اب تک ان کی یاد جاں آفرین ہے۔ دارالمصنفین میں تو گویا تجدید بیعت ہو جاتی ہے :

داغ دل در بیں جاگاہ گاہے چاق می گردد   خدا آباد تر سازد خرابات محبت را"

اور مولانا آزاد ان کے حضور میں خراج عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں :

"فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی۔ جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، سرتاسر مغز بے پوست تھی ..... وہ کیا گئے علم وفن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہو گیا۔... ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طلب علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکی طبع جو اس راہ کے مہالک و آفات میں ہے، انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی ....

ہندستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہوئی"۔

ایک دوسری ذات حکیم محمد اجمل خاں کی تھی۔ ان کے بارے میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں :

"ان کی یاد دہلی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو گئی ہے کہ یہ لفظ بغیر انہیں یاد کیے بول نہیں سکتا۔ دل کے بہت زخم ہیں جو امتداد زمانہ سے داغ بن کر رہ گئے ہیں۔ ع

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا۔

لیکن یہ زخم اب تک نہ بھر سکا۔ ع

جوشید خونِ تازہ ز داغِ کہن مرا"۔

بعض اور بھی حضرات ہیں جن کا ذکر نواب صاحب اور مولانا کی خط و کتابت میں اکثر آتا ہے۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر آصف علی صاحب اور ڈاکٹر سید محمود ہیں۔ ڈاکٹر محمود سے ایک ملاقات کا حال نواب صاحب کس خلوص اور لطف سے بیان کرتے ہیں :

"ڈاکٹر سید محمود برسوں میں ملے پھر بھی دل افزا اخلاص سے بدستور نرم و گرم تھا، ملے اور خوب ملے۔ بڑی جاں افزا اور روح پرور صحبت رہی :-

ہر جا کہ من و دوست بہم باز رسیدیم   از بیم بد اندیش لب خویش گزیدیم

بے واسطۂ گوش ولب ازراہِ دل وچشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم"

یہاں نواب صدر یار جنگ کے کردار کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر دینا بے جا نہیں ہوگا۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے۔ طبعاً سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ تحریک عدم تعاون میں علی گڑھ کالج کی شرکت اور عدم شرکت کے مرحلے پر بعض قومی رہنماؤں سے ان کے اختلافات بھی رہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ انگریز پرست ہرگز نہیں تھے۔ بلکہ ہندوستان پر غیر ملکی تسلط کا انھیں بہت افسوس تھا، اگرچہ اس میں سیاسی شعور سے زیادہ قدیم تہذیبی روایات کے زیاں کے احساس کو دخل تھا۔ خود مجھ سے انھوں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک دفعہ فرمایا کہ جب کوئی نیا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ علی گڑھ آتا ہے تو ہم اس سے صرف ایک دفعہ ملنے کے لیے جاتے ہیں، بغیر ضرورت کے دوبارہ کبھی نہیں جاتے۔ اس وقت سرکاری کارندوں کے ساتھ زمین داروں کا عام طور پر جو رویہ تھا اُسے دیکھتے ہوئے یہ معمولی بات نہیں تھی۔ انگریزی حکومت نے کئی دفعہ کوشش کی کہ انھیں خطاب سے "نوازے" لیکن انھوں نے کبھی اس کے لیے آمادگی ظاہر نہ فرمائی۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ ان کے لیے "شمس العلما" کے خطاب کی سفارش ہونے والی ہے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مطلع کر دیا کہ اگر انھیں خطاب دیا گیا تو اسے قبول نہیں کریں گے اور اس سے غلط فہمی پیدا ہوگی۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس کی سفارش نہ کی جائے۔ دوسروں کو بھی جب خطاب ملتا تو اس کا ذکر تمسخر سے کرتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ جب مغل سلاطین کسی کو اعزاز عطا کرتے تھے تو اس کے ساتھ جائداد بھی دیتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس انگریز چندہ لے کر خطاب دیتے ہیں۔ البتہ ریاست حیدرآباد کا خطاب صدر یار جنگ انھوں نے نہ صرف قبول فرمایا بلکہ بعض اوقات دستخط بھی یہی فرماتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں انھیں انگریزوں کے مقابلے میں محوری طاقتوں سے ہمدردی تھی۔ ظاہر ہے اس کی وجہ ہندوستان کی غلامی کا شدید احساس ہی تھا اگرچہ عملی سیاست سے بے تعلق ہونے کی بنا پر محوری طاقتوں کی فتح کے اثرات کا پورا ادراک نہیں کر پاتے تھے۔ صوبہ سرحد کے آزاد قبائل کی ان کے دل میں اس وجہ سے بڑی قدر تھی کہ انھوں نے بدیشی حکومت کا تسلط قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی طبیعت کا یہی پہلو تھا جس کی بنا پر انھیں بعض قومی رہنماؤں سے خصوصی تعلق خاطر تھا۔ ان میں مولانا آزاد کے علاوہ حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا حسین احمد

مدنی، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ تصدق احمد خاں شروانی اور نثار احمد خاں شروانی کی تعلیم میں ان کا بڑا ہاتھ تھا اور قومی زندگی میں ان کی ترقیوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ البتہ کسی شخص سے تعلق خاطر ہونے کی ان کے یہاں دو بہت ضروری شرطیں تھیں، سلامت روی اور رکھ رکھاؤ۔ اسی لیے علی برادران، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے لوگوں سے انھیں کبھی دلچسپی نہیں ہو سکی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے اس رویے سے بھی نالاں تھے کہ انھوں نے سیاسی اختلافات کو دارالعلوم دیوبند کے اندرونی معاملات میں اثر انداز کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کی مذہبی ہمت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو میں علی گڑھ سے باہر تھا۔ اس موقع پر مجھے حبیب گنج سے خاص طور پر مبارک باد کا خط تحریر فرمایا، جس میں لکھا تھا: "کل بعد جمعہ جشن ۱۵ اگست منایا گیا، شب کو چراغاں ہوا، مبارک" ہندو مسلم منافشات سے انھیں قلبی تکلیف ہوتی تھی اور ایسے موقع پر گزرے ہوئے زمانے کو یاد فرماتے تھے جب ہندو مسلمان شل بھائیوں کے شیر و شکر رہتے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہندو یونیورسٹی بنارس کے استاد رام کمار چوبے صاحب کو ان کے خط کے جواب میں لکھا:

"آج کل ہندو مسلمان کا ہنگامہ ہے، ہر گا جہاں ہو گا۔ بزرگ ملے ہیں ان میں وہ رنگ ہے جو آپ کے خط کا ہے اور جو میرے دل کا ہے۔ آپ یقین کریں جو ہنگامہ آج ہے اس کا اثر کبھی دل پر نہیں ہوا..... ہندو مسلمان کا سوال کیسا!"

حصولِ آزادی اور تقسیم وطن کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں ترکِ سکونت کر کے پاکستان جانے کی جو لہر اٹھی تھی اسے بالکل پسند نہیں فرماتے تھے اور لوگوں کو اس سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

نواب صاحب اور مولانا آزاد کو ایک دوسرے سے جو گہرا قلبی تعلق تھا اس پر "کاروانِ خیال" اور "غبارِ خاطر" کے خطوط شاہد ہیں۔ بہر رنگ "کاروانِ خیال" کے خطوط میں اس لیے زیادہ گہرا ہے کہ وہ واقعی خطوط ہیں، خیالی مضامین نہیں ہیں۔ تاہم اس اعتبار سے "غبار خاطر" کی بھی بہت اہمیت ہے کہ اس مخاطبت کے لیے مولانا آزاد نے نواب صاحب ہی کا انتخاب فرمایا جس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے حسرت سے لکھا کہ ان خطوط کے مخاطب تنہا صدیق

مکرم حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں۔" خود نواب صاحب کو بھی اس کا بہت احساس تھا، چناں چہ "غبارِ خاطر" کی وصول یابی پر مولانا آزاد کو تحریر فرماتے ہیں: "اسی عرصے میں دو نسخے "غبارِ خاطر" کے نورافزا ہوئے۔ غبار اور نورافزائی! ہاں نورافزائی! غبار تھا کوئے دوست کا! آنکھوں سے لگایا، پڑھا، پڑھوں گا۔ زہے قسمت کہ گوشۂ تنہائی میں انیسِ صحبت حبیب رہا۔ بزم انس اس قدر طویل کہ مجلد کا سامان تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ تاریخی واقعہ بنے گا۔ شکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو۔" مولانا آزاد تقریباً ہمیشہ ہی نواب صاحب کو "صدیق" و "مکرم" سے مخاطب کرتے تھے مگر نواب صاحب نے مختلف خطوط میں مختلف القاب لکھے ہیں اور ان سے بھی مولانا کے لیے نواب صاحب کے جذباتِ خلوص و مودّت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا سب سے پسندیدہ طرزِ تخاطب "صدیق حبیب" ہے۔ بعض دوسرے القاب یہ ہیں: مکرم حبیب، صدیق صمیم، حبیب نواز، آشنا پرور، صدیق حبیب بہ دل قریب اور "صدیق مکرم" کے مکرم باکرامت۔ ایک دوسرے کا خط آنے پر جو مسرت ہوتی تھی اور جو دونوں ایک دوسرے کے لیے جن جذباتِ خلوص وانس کا اظہار کرتے تھے اس کا اندازہ بعض اقتباسات سے بہ خوبی ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب پہلا خط موصول ہونے پر تحریر فرماتے ہیں:

"کیا کہوں کس قدر مسرت نامۂ گرامی پڑھ کر ہوئی اسی وقت مکرر پڑھا۔ اس کے بعد کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار دماغ و دل بوئے محبت سے باغ باغ ہوا ہے۔ خلوص سدابہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔"

اس کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں:

"سفر سے واپس ہوا تو ڈاک میں صحیفۂ مودّت ملا طبیعت تھکی ہوئی اور ہجومِ اشغال سے بے کیف تھی۔ لیکن آپ نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کر کے ساری تھکن بھلا دی ؎

وحلّ ثنتنی یا سعد عنھا فزدتنی   جنوناً فزدلی من حدیثک یا سعد!

..... دیکھیے آپ کی صدائے دل نواز نے دلِ ہزار شورش کے ساتھ کیا کیا، جدید آدابِ مکاتبت سے قطع نظر کر کے کاغذ کے دونوں صفحے سیاہ کرتا رہا، پھر بھی پانچ ورق ختم ہو چکے

اور شوقِ مخاطبت ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لیتا ع

بصد دفتر نمی گنجد حدیثِ دردِ مشتاقے

"ہر چند چاہتا ہوں قلم روکوں مگر رُک نہیں سکتا۔"

ایک اور خط میں نواب صاحب رقم طراز ہیں "صحیفۂ نابغہ کا شکرِ مکرّر۔۔۔ ایک بار پڑھا، اسی صحبت میں دوبارہ پڑھا، تیسری مرتبہ آواز سے پڑھا۔۔۔ ہر بار کے پڑھنے میں یہ عالم تھا کہ دل کسی مخلص کے معانقے کی گرمی کا لطف محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں پُرنم تھیں۔ چوتھی مرتبہ اس وقت پڑھ کر جواب لکھنے بیٹھا ہوں۔" اس کے جواب میں مولانا جذباتِ لطف و محبت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

"تعلیقۂ گرامی میں صرف الفاظ ہی نہ تھے، خوشبو بھی تھی۔ آنکھیں سوادِ خط سے خورسند ہوئیں، دماغ نے محبت بے ریا اور خلوصِ اہلِ صفا کا عطر سونگھا۔ انفلوئنزا کی شدت سے سر قابو میں نہ تھا، جسم بے حال ہو رہا تھا ؎

ز بے تابی سرم می گردد و بالیں نمی یابد

"مگر آپ کی صدائے محبت نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اب تکیے کے سہارے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔"

"ز نسیمِ جاں فزایت دلِ مردہ زندہ گردد — زکدام باغے اے گل کہ چنیں خوش ست بویت"

یک سالہ نظر بندی کے بعد ۱۹ فروری ۱۹۴۲ء کو مولانا نے نواب صاحب کو صرف ایک شعر لکھ کر بھیجا ؎

"وفا کنند کہ بیگانہ آشنا گردد — ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے را"

دیکھیے اس کا جواب نواب صاحب کس خلوص و محبت سے دیتے ہیں: "گل جاں پرور نامہ پہنچا۔ دیکھ کر دل فرطِ شوق سے تڑپ گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا ؎

بوئے خوشِ تو ہر کہ ز بادِ صبا شنید — از یارِ آشنا سخنِ آشنا شنید

"زیب نامہ صرف ایک سطر تھی مگر ایک دفترِ محبت اس میں بھرا ہوا تھا۔ محبت نہ ہو تو شکوۂ ناآشنائی کیوں ہو، جو شکوہ خبرِ محبت دے اس پر سو شکر قربان۔۔۔ شکر ہے کہ بالآخر نظرِ آشنائے توجہ ہوئی، نصف مکالمت کا موقع ہاتھ آیا۔ شکوۂ ناآشنائی نے کیا کہوں کیا لطف دیا۔ کس زبان سے کہوں، کس قلم سے لکھوں۔۔۔ ارادہ کیا جواب صبح لکھوں گا، نصف ملاقات کا سرور حاصل کروں گا۔ اسی سرور میں آمادۂ خواب ہوا۔ آمدِ خواب کے کیف

میں جانب نیشاپور سے آواز آئی ؎

شب امید بہ از صبح عید می گزرد   کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتہ ست

"کیف در بالا ہو گیا۔ شب کو جب آنکھ کھلی، یہی آواز جاں نواز رہی۔ بیداری بھی خواب کی طرح شیریں رہی۔ ارشاد ہے نئی پرسی۔ حقیقت سنج محبت عرفی شیرازی نے جس کے آشنا سنج ہونے کی قسم کھائی ہو وہ نہ پوچھے، کیوں کر ممکن ہے؟ :

"بنام آں حبیبِ آشنا سنج   کہ در آرائش معمورۂ رنج

"...... صرف انتظار موقع تھا، حافظ کا یہ شعر وردِ زبان :

"ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبح گاہی   بہ پیام آشنائے بنوازد آشنارا

"شکر ہے موقع آیا، شکوہ نا آشنائی ہوا، بروقت ہوا اور بجا ہوا۔ زندہ باد آزاد!"

ایک دفعہ کسی مصروفیت کی بنا پر نواب صاحب مولانا کے خط کا جواب نہیں بھیج سکے تو مولانا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا :

"شرابِ لطف پر در جام می ریزی دی ترسم   کہ زود آخر شود ایں نشہ و من در خمار افتم"

جواب میں نواب صاحب نے اسی شعر کو بدل کر اس طرح لکھ دیا :

"شرابِ لطف می دارم خم اندر خم، چہ می ترسی   نہ زود آخر شود ایں نشہ و نے در خمار افتی"

جب مولانا جون ۱۹۴۵ء میں قلعہ احمد نگر کی طویل نظر بندی سے رہا ہو کر سیاسی مذکرات میں حصہ لینے شملہ پہنچے تو وہیں وایسرائے گل لاج سے پھر صرف ایک شعر کا خط لکھا :

"اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل   می بینمت عیاں و دعا می فرستمت"

اس کا جواب بھی نواب صاحب نے حسب معمول پورے لطف و سرور سے دیا۔ لکھتے ہیں :

جس دن بدر کامل گہن سے نکلا تھا، دل نے شہادت دی کہ نورِ محبت جاں نواز ہوگا۔ ہوا اور کس شان سے۔ ۲۷؍ جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ہنگامہ ایک گرد پ کے رنگ میں نظر آیا۔ اس میں ایک پیکر محبوب بھی تھی۔ قینچی لی، مجمع اغیار سے جدا کیا۔ دیکھا، شیراز کی طرف سے صدا آئی

"روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست   منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست

"..... خیر یہ شیراز کا ترانہ تھا۔ کان لگاتا ہوں تو شملہ سے دوسرا ترانہ سامعہ نواز ہوتا ہے :

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل   می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

"جو کان نے سنا، تیسرے روز نقوشِ دل فروز کے پردے میں آنکھوں نے دیکھ لیا۔

اجازت ہو تو دوسرا مصرع میں بھی لکھ دوں: "می بنیمت عیاں و دعا می فرستمت"۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا بحالیِ صحت کے لیے گل مرگ (کشمیر) تشریف لے گئے تو نواب صاحب نے حسب ذیل "نامۂ منظوم" وہاں بھیجا:

"محو نظارۂ گل مرغ نگارے دارم — کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بہ حضورش گزری — عرضہ دہ شوق کہ در جان فگارے دارم
در بپرسد کہ مگر شوق پیامم دارد — سر فرو دار و زمن گوئے کہ آرے دارم"

اور ساتھ ہی یہ شعر بھی لکھا ؎

"دوردستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است — ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند"

اور آخر میں دستخط اس طرح کیے: "اسیرِ آزاد، جبیب"۔ قدرتی طور پر مولانا اس سے بہت متاثر ہوئے اور جواب میں لکھا: "کیا عرض کروں، کس درجہ طبیعت متاثر ہوئی۔ سر تا پا شکر گزار اور ہمہ تن رہینِ منت ہوں ؎

"قلیل منک یکفینی، ولٰکن — قلیلک لا یقال لہ قلیل"

یہ تو نصف ملاقات پر جذباتِ لطف و مودّت کی کیفیت تھی لیکن مکمل ملاقات کے لیے دونوں کتنے بے تاب تھے اور دونوں طرف شوق کی آگ کتنی تیز تھی اس کا اظہار بھی "کاروانِ خیال" کے خطوط میں بار بار ہوتا ہے اور پوری گرم جوشی سے ہوتا ہے۔ پہلے ہی خط میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں: "بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملاقات ہوتی انکارِ زمانہ اور کاوش ہائے روزگار سے الگ ہو کر دو گھڑی بیٹھتے اور پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرتے۔ جام و مینا کا دور نہ سہی، چائے کے پیالہ ہائے پیہم کیا کم ہیں ؎

زخیل دردکشاں غیرِ ما نماند کسے — بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے"

اس کے جواب میں نواب صاحب رقم طراز ہیں: "محبت نامے نے شوقِ ملاقات کی سوزش میں اشتعال پیدا کر دیا ہے۔ دل میں بے تابی ہے کہ ملاقات ہو جو صحبتِ گذشتہ کی گرمی تازہ کرے، حیات تازہ بخشے۔ سوال یہ ہے کہ کہاں ہو؟" پھر مولانا لکھتے ہیں "کاش خط کی جگہ ہم نشینی و ہم زبانی کا موقع نکلتا۔ اگر گزری ہوئی محفلوں کو واپس نہیں لا سکتے تو کم از کم ان کی یاد میں اپنی سوگواریوں کی ایک نئی محفلِ غم تو برپا کر سکتے ہیں۔

ایک اور خط میں مولانا ہی تحریر فرماتے ہیں:

"اگر حالات کی رفتار ایسی نہ ہوتی تو یقین کیجیے دل آرزومند کی شورشوں کا یہ حال ہے کہ کلکتے سے اٹھتا اور سیدھا بھیکم پور پہنچ کر آپ سے بغل گیر ہوتا"۔

وابرح ما یکون الشوق یوما
اذا دنت الخیام من الخیام"

ایک دفعہ نواب صاحب کسی کام سے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ واپسی میں واردھا اسٹیشن پر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کی "دس منٹ پہلے تشریف بری ہو چکی تھی"۔ جب اس کی اطلاع مولانا کو دی تو انھوں نے جواب میں حسرت سے لکھا: "کیا عرض کروں واردھا کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکنے کا کس درجہ افسوس ہوا۔ آج کل نظم ونسق کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو رہا ہے۔ کوئی ٹرین وقت پر نہیں پہنچتی۔ کم بخت کلکتہ میل کو اسی دن وقت پر پہنچنا تھا۔ آپ سے ملاقات کا معاملہ میرے لیے وہی ہو گیا ہے جو غالب کو پیش آیا تھا کہ ہم لوگ کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو؟ معلوم نہیں ادھر دہلی جانے کا کوئی موقع نکلتا ہے یا نہیں۔ اگر نکلے اور میں آپ کو اطلاع دوں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دو دن کے لیے آپ بھی اس خرابے میں آنکلیں؟" بہر حال بڑی حسرت وتمنا کے بعد ۱۹۴۶ء میں ملاقات کی صورت نکلی۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب ہو چکے تھے اور مولانا وزارت سازی کے سلسلے میں لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ حسن اتفاق سے نواب صاحب بھی اسی زمانہ میں کسی کام سے وہاں تشریف لے گئے۔ جب معلوم ہوا کہ مولانا تشریف فرما ہیں تو کیسے ممکن تھا کہ بغیر ملے ہوئے چلے آتے۔ ملاقات ہوئی لیکن درِ غیر پر اور اجنبی ماحول میں۔ مولانا کی مصروفیت ظاہر تھی اور اس لیے فراغت اور اطمینان کی ملاقات ممکن نہیں تھی۔ اس ملاقات کی کیفیت ۴ مئی ۱۹۴۶ء کے خط میں مولانا ہی کی لکھتے ہیں:

"اس روز لکھنؤ میں نظارۂ جمال اگرچہ — خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

کا مصداق تھا لیکن دل میں گرمئ شوق پیدا کرنے میں کامیاب تھا۔ دن بھر مکرر شوقِ لقا کی تمنا دل میں رہی" اس کے چند مہینے کے بعد یکم نومبر ۱۹۴۶ء کو مولانا تحریر فرماتے ہیں: "بہت جی چاہتا ہے کہ یک جائی کی صورت نکلے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ادھر قصد کر رہا ہوں کہ کچھ عرصہ دہرہ دون میں قیام کروں کیوں کہ صحت جواب دے رہی ہے۔۔۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ آپ دو چار دن کے لیے دہرہ دون تشریف لا سکتے اور میرے ساتھ

قیام فرماتے۔

"فرخندہ شبے باید وخوش مہتابے   تا با تو حکایت کنم از ہر بابے"

اس کے جواب میں نواب صاحب لکھتے ہیں اور کتنی گرم جوشی اور شگفتگی سے لکھتے ہیں:

"والطاف نامے سامنے ہیں...... دوسرے میں قدومِ دہرہ دون کی (خبر ہے) اس کے بعد مخلص کی یاد فرمائی یقین کیجیے دل مسرتِ شوق سے تڑپ گیا۔ آیئے آیئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ لطفِ ہم دلی وہم نشینی ہوگا۔ ملا جی بھی ساتھ ہوں گے۔۔۔ ماشاء اللہ کیا پرلطف وقت ہوگا جب کہ:

"گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم   بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

" کے جواب میں اپنا ایک شعر عرض کردوں گا ؎

شکر اللہ! بروئے تو قدح می نوشیم   جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی"

چوں کہ مولانا آزاد نے اپنے خط میں خرابی صحت کی اطلاع بھی دی تھی اس لیے اس پر اظہار تشویش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آپ کی صحت صرف آپ کی ملکیت نہیں ہے ملک وملت برابر کے، بلکہ شریکِ غالب ہیں، ایک با اخلاص مخلص بھی۔ لہٰذا اس کی حفاظت کی خاطر آرام کیجیے، دہرہ دون کا سفر کیجیے، مخلص کی یاد فرمائی ہو۔" لیکن مولانا آزاد دہرہ دون نہ جا سکے اور یک جائی وہم نشینی کا موقع نہیں مل سکا۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم مقرر ہوگئے اور مستقل دہلی میں قیام ہوگیا۔ علی گڑھ سے دہلی دور نہیں تھی لیکن ایک طرف نواب صاحب کی صحت کمزور ہوگئی تھی اور دوسری طرف مولانا کی مصروفیات اور پریشانیاں روز افزوں تھیں اس لیے عرصے تک ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکل سکی۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں اس وقت کے گورنر جنرل شری راج گوپال آچاری کا علی گڑھ یونیورسٹی میں آنا طے ہوا۔ کسی نے نواب صاحب کو بتایا کہ اس موقع پر مولانا آزاد کی تشریف آوری بھی ہوگی۔ نواب صاحب نے انہیں دعوت دی کہ جب علی گڑھ تشریف لائیں تو "حبیب منزل" میں قیام فرمائیں۔ اس کے جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا: "۱۵؍دسمبر والی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ ابھی کوئی تاریخ متعین نہیں ہوئی جب کبھی موقع پیدا ہوا آؤں گا۔ اور ملاقات سے شادکام ہوں گا۔ حبیب منزل میں قیام کی دعوت کے لیے شکر گزار ہوں، لیکن کیا اس کی ضرورت تھی؟ آپ دعوت دیں یا نہ دیں، اگر میں کہیں ٹھہر سکتا ہوں تو وہ صرف آپ ہی کا کاشانۂ محبت ہے ——— دریں شہر سعدی

مبسم دلبس۔"

مولانا کی تشریف آوری ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ نواب صاحب نے جس ذوق وشوق سے یونیورسٹی کانووکیشن میں شرکت فرمائی اس کا حال مدیر "نیا ہندوستان" علی گڑھ کے الفاظ میں سنیے: "حضرت شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے دیدار کی حسرتیں جس انداز میں نکالیں وہ دیدنی تھیں۔ آپ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ میں تو صرف یہ دیکھنے کانووکیشن اجلاس میں جاؤں گا کہ "ابوالکلام آج اس درجۂ علیا پر فائز ہو کر کیسے معلوم ہوتے ہیں۔" جن لوگوں نے نواب صاحب کو امام الہند کے چہرے کی طرف سراپا اشتیاق نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھا ہے کچھ وہی اس سے حظ اٹھا سکتے ہیں:

"پھر ہم کہاں، کہاں تم، جی بھر کے دیکھنے دو
"اللہ! کتنی مدت تم سے جدا رہے ہیں"

"مولانا کا قیام تو اپنے سیلون میں اسٹیشن پر رہا لیکن حبیب منزل تشریف آوری اور چائے نوشی ہوئی اور "نیا ہندوستان" ہی کی شہادت کے مطابق "پچھلی علمی وادبی صحبتوں، یگانۂ روزگار ہستیوں اور کتابوں اور کتب خانوں کا ذکر ہوتا رہا"۔ اس کے بعد ان دونوں دوستوں کی ملاقات پھر کبھی نہیں ہو سکی تا آں کہ ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء کو نواب صدر یار جنگ نے رحلت فرمائی۔ سدا رہے نام اللہ کا!

مولانا آزاد اور سر عبدالقادر

ھنس راج رتن

۱۹۴۷ء سے قبل کے برصغیر پاکستان و بھارت میں جب اخلاقی بیداری یا بدبیداری کی تاریکیوں کو اڑا رہی تھی جب گھانس پھونس کی جھونپڑیوں سے اٹھ کے فدایان وطن غیر ملکی حاکموں اور جابروں کے عظیم الشان محلات میں زلزلہ برپا کر رہے تھے زندہ ہونا ایک عجیب نعمت تھی لیکن دور انقلاب میں جوان ہونا تو بقول شاعر بہشت سامانیوں کو ہم آغوش کرنا تھا اور میں ایسے میں جوان تھا۔

رہنمایان وطن کا جلوس جس سمت جاتا میں بھی کشاں کشاں ادھر کو اپنا منہ موڑ لیتا۔ اور اس تلاش و جستجو میں میری ملاقات غالباً سب قسم کے لیڈروں سے ہوتی۔ لیکن نقد ذی کی کسوٹی نے ان میں جن کو چنا وہ عشق وطن کے ایسے مجنوں تھے کہ کسی دوسرے کا لیلیٰ بننا بھی ناممکن ہے ان میں بعض علم و ادب کے وہ آشنا تھے کہ جن کی نورانی کرنیں دل کی تاریکیوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی عظمت بخشتی تھیں کہ جب ان کے حسین چہرے یاد آتے ہیں تو ایک ٹھیس سی لگتی ہے کیا یہ لوگ زندہ جاوید ادر امر نہیں ہو سکتے تھے کیا ہم اپنی عمران کے قدموں پر نثار نہیں کر سکتے تھے۔

جن کا ذکر اس مضمون میں کرنے لگا ہوں وہ ایک ایسے باکمال ادیب، شاعر، عالم، محقق، سیاست دان اور انسان تھے کہ شاید صدیاں سرگرداں رہیں اور کوئی ثانی پیدا نہ ہو اور وہ ہیں مولانا ابوالکلام آزاد۔

مولانا آزاد سے میری ملاقات شملہ میں ہوئی جب آپ کرپس مشن کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے تھے۔ میرے ہمراہ میرے ایک دوست محمد شریف تھے جو ان دنوں پاکستان میں ہیں۔

بات سیاسیات پر چلی لیکن جلد ہی مولانا آزاد علم و ادب کی دنیا میں پہنچ گئے اور میرے مضمون پر بحث کرنے لگے "غزل کا ہر ایک شعر ایک بے مثال جواہر ہے، غزل پچاس شعر

کی ہو یا پانچ شعر کی۔ اس کا ہر شعر ایک نئی کیفیت، ایک نئے جذبے، ایک نئے تجربے کا حامل ہوتا ہے۔ میں نے ان کی توجہ غزل پر اس زمانے میں جو اعتراضات ہوئے اس پر دلائی تو فرمایا کہ ان اعتراضات پر غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ غزل الگ صنفِ سخن ہے۔ اسے قطعہ یا نظم بنانا یا اس سے وہ چیزیں مانگنا جو اس کے دامن میں نہیں آتیں۔ کوئی ادب پرستی اور سخن فہمی نہیں۔

اقبال کا ذکر آیا تو درجنوں اشعار سنا کر کہنے لگے۔ آفاقیت کا تصور کسی مذہب سے متصادم نہیں ہوتا۔ نہ جانے اقبال کے اشعار کو مذہب کی رہنمائی کا حربہ کس طرح تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اقبال ہی کے ضمن میں انہوں نے فرمایا کہ سر عبدالقادر کا درجہ برصغیر میں وہی ہے جو کسی بڑے شیخ کا ادب و علم کی پرورش میں ہو سکتا ہے۔ جب سر عبدالقادر کا ذکر کر رہے تھے تو مولانا کی آنکھوں میں پیار کی ایک تیز چمک نمایاں تھی۔ کہنے لگے کہ سر عبدالقادر نے میرا مضمون شائع کیا تھا حالانکہ میں اس وقت بہت کمسن تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے مضمون کا انتخاب کیا اور کلماتِ توصیف لکھے اس سے ان کے نظر کی گہرائی ہویدا تھی وہ تو جوہری تھے جوہری، جس پر ان کی نظر انتخاب پڑی، چمک اٹھا۔

میں نے مولانا آزاد کو کسی کے ذکر میں اس قدر رطب اللسان اور پرجوش نہیں پایا جس قدر سر عبدالقادر کے بیان میں۔ اور چند دنوں کے بعد جب میں سر عبدالقادر کے ہاں گیا تو وہاں میں نے اس ملاقات کا ذکر کیا سر عبدالقادر کہنے لگے کہ مخزن کا اجرا ہوا تو میری یہ کوشش تھی کہ ملک کے ہونہار نوجوانوں کو نئی سوچ دوں اور خیالات کے وہ خزانے پیش کروں کہ جہاں اردو ادب کی ترقی ہو۔ وہاں جذبات میں گہرائی، نظر میں عمق پیدا ہو اور تجربات کا ایک ایسا مخزن ہو کہ وطن کے نوجوانوں کو اس سے فیض حاصل ہو سکے لہٰذا میں نے ہر قسم کے مضامین ہر قسم کے اہل علم وفن سے حاصل کیے۔ ایک مضمون مولانا ابوالکلام نے بھی بھیجا میں نے اسے شائع کر دیا میرا یقین تھا کہ اس مضمون کے لکھنے والے کے قلم میں وہ طاقت آ رہی ہے جو شاید اس سے قبل برصغیر میں کسی نے محسوس نہ کی ہو۔ طرزِ تحریر خطیبانہ تھا لیکن الفاظ کے ایسے ٹکڑے بن رہے تھے جو نظروں کے سامنے حقیقت کے نقشے اڑاتے تھے ہم میں ایسے سیکڑوں ہیں جو خیالوں کی روانی کو غیر ٹھوس الفاظ میں بیان کر سکیں لیکن ایسے خال خال ملیں گے جو غیر ٹھوس خیالات کو بھی ٹھوس الفاظ میں نبھا سکیں اور میں مولانا آزاد میں یہ خوبی دیکھ رہا تھا جب مضمون شائع ہو گیا تو میرے عزیز دوست غلام بھیک نیرنگ نے اس مضمون پر اعتراض کیا اور اسے معیار سے کمتر بتایا میں نے ان کا دھیان

اس طرف دلایا کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" ثقافت میں یہ نئی روح تھی، صحافت میں نئی طرز تھی، ادب میں نیا رنگ تھا، تحریر میں ایک نیا اسلوب تھا، اور زمانے نے دیکھ لیا کہ میری نظر غلط جگہ نہیں پڑی تھی۔

اقبال کے ضمن میں ہی مولانا شبلی مرحوم کا ذکر آ گیا تو مولانا فرمانے لگے کہ برصغیر میں فارسی کے شعر کا کہتے ہیں خاتمہ غالب پر ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ خاتمہ مولانا شبلی پر ہوتا ہے۔ مولانا شبلیؔ جس کیفیت، انداز، اور جذبات سے فارسی میں شعر کہتے ہیں بالکل ایرانی جذبات کے عکاس معلوم دیتے ہیں۔ کہنے لگے کہ غالب کا میدان تغزل اور مدح ہے اس سے باہر وہ نکلے نہیں اور اس کے اندر ان کے مدمقابل سینکڑوں دوسرے ایرانی اور ہندوستانی شاعر ہیں لیکن مولانا شبلیؔ نے فکر و تخیل کے جن نئے میدانوں میں معرکہ آرائی کی ہے ان سے مولانا شبلی کے وسیع فکر و نظر اور عالمگیر انسانیت کا احساس ہو سکتا ہے۔ مولانا شبلی کے چند فارسی اور اردو کے اشعار پڑھنے کے بعد کہنے لگے کہ تم بتاؤ فارسی کے نئے شاعر کیسی وطنی نظمیں کہتے ہیں میں نے ملک الشعراء بہار، اشرف الدین گیلانی اور مولانا محمد باقر کے اشعار پڑھ کے سنائے۔ مولانا بولے خدا کا شکر ہے کہ تم نے بامعنی اشعار یاد کیے ہیں ورنہ حالت یہ ہے کہ جب کبھی میں نے ایران کی وطنی نظموں کا مطالعہ کیا بدمزہ ہوا اور بہار تو بے بہار ہے۔

پروفیسر براؤن کی داد دینی چاہیے کہ اس نے جدید فارسی کو بھی کچھ معنی پہنا دیے ہیں کہاں جامیؔ کہاں فردوسیؔ۔ کہاں حافظ کہاں سعدی، اور کہاں یہ تُک بند!

شاعروں کے قبول عام اور حالات کی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اب شاعروں یا ادیبوں کو شاہوں اور امیروں کا دست نگر نہیں ہونا پڑے گا عوام کے اس دور میں شاعروں کی عزت کا خود ہی دنیا سامان پیدا کر دے گی غالب بدنصیب تھا کہ غدر سے پہلے ہوا اور عمر بھر بہادر شاہ کی لاحاصل مداحی کی اور ایسے ایسے قصیدے ضائع کیے جو عرفیؔ اور نظیریؔ کے قصائد سے مقابلے کا دم رکھتے تھے لیکن عرفیؔ اور نظیریؔ کے سر پر جہانگیر ایسے سخن پرور شاہ کا ہاتھ تھا۔ لیکن بہادر شاہ کے سر پہ تاج تو مغلوں ہی کا تھا لیکن نہ ہاتھ میں سکت تھی اور نہ سر میں فخر اگر غالب اس دور میں زندہ ہوتے اور وطن کی اس جدوجہد میں ان کے جذبات ابھرتے تو وہ قوم و وطن کی آزادی میں وہ کردار ادا کرتے جو انقلاب فرانس میں متعدد شعرا نے کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب برصغیر تقسیم ہوا تو مجھے مولانا آزاد سے ملنے کا کئی بار شرف حاصل ہوا۔

میں ان دنوں بند سے مانزم کا ایڈیٹر تھا اور چند وضاحتوں کے سلسلے میں حاضر ہوا کرتا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا کہ ۱۹۴۷ء کے واقعات نے ان کے جذبات کو منجمد کر دیا ہے اور ان کے دل میں ایک افسوس نے جگہ لے لی ہے ۔

ایک روز میں نے جرأت کر کے ان کے الفاظ کو ذرا توڑ کر یوں شائع کیا ۔

"تاریخ عالم کی سب سے نامور ہستیاں حکومت کے ایوانوں میں آکر مایوس ہو گئیں ۔"

مولانا آزاد نے ان کو پڑھا اور دوسری ملاقات میں فرمایا "مایوسی کی وجہ یہ ہے کہ میں خود کو پھر تنہا پا رہا ہوں" ۔ مولانا آزاد واقعی تنہا رہے دنیا کے ہنگامے کھینچ کر انھیں اپنے قریب لے آتے لیکن وہ پھر کنارہ کش ہو جاتے ۔ اور آج تو وہ ہم سے ایسے روٹھے ہیں کہ ہمیں تنہائی کا احساس ہونے لگا ۔ میری اپنی حالت کیا ہے ؟ اس کا اندازہ اس یتیم کو ہو سکتا ہے جس نے تلاش بسیار سے دو مہربان چنے تھے کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ آماجگاہ الفت کے لیے اور آج میں ان دونوں کی رہنمائی سے محروم ہوں ۔ نہ مولانا آزاد ہیں نہ سر عبدالقادر ، کاش یہ دونوں ہوتے اور اس وقت دلوں کے چاک سیتے !

مولانا آزاد اور سید سلیمان ندوی

عبداللطیف اعظمی

حضرت سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کی تاریخ ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تاریخ پیدائش اگست ۱۸۸۸ء ہے۔ گویا کہ سید صاحب مرحوم مولانا سے تقریباً چار سال بڑے تھے۔ عمر کا یہ فرق زندگی کے بعد بھی باقی رہا۔ سید صاحب مرحوم نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو انتقال فرمایا اور اس کے تقریباً چار سال بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

دونوں کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے اواخر میں لکھنؤ میں ہوئی اور تقریباً پانچ چھ ماہ ساتھ رہا اور تقریباً اتنا ہی عرصہ ۱۹۱۲ء میں کلکتہ میں دونوں بزرگوں کو ایک دوسرے کے قرب کا موقع ملا۔ اس وقت سے لے کر جب تک سید صاحب پاکستان تشریف نہیں لے گئے تھے، ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور ۱۳-۱۹۱۴ء سے لے کر ۴۷ء تک دونوں کے مابین مراسلت کا تعلق بھی استوار رہا۔ مولانا آزاد کے ۳۸ خط دونوں کے مابین لطف و محبت کی یادگار ہیں۔ دونوں کے ربط و محبت اور گوناں گوں تعلقات کی تاریخ اڑتالیس برسوں کے شب و روز پر پھیلی ہوئی ہے۔

دونوں کے علمی خصائص اور خدمات کے میدانوں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے دونوں نے صحافت کے کوچے میں قدم رکھا، دونوں عالم دین تھے، دونوں بہترین ادیب اور انشا پرداز تھے۔ زبان و ادب کے مسائل سے دونوں کو دلچسپی تھی۔ تصنیف و تالیف کے میدان کے دونوں شہسوار تھے۔ ادب، تاریخ، سیرت، حدیث، فقہ، اصول اور بے شمار اسلامی مسائل پر پھر ایک نے ہزاروں صفحے لکھ ڈالے۔ دونوں ایک ہی

مذہبی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ سیاست میں دونوں ہم خیال تھے۔ خلافت، جمعیت علمائے ہند، کانگرس کی سرگرمیوں میں دونوں شریک رہے۔ دونوں نیشنلسٹ تھے۔ دونوں بزرگ صاحب علم وفضل تھے۔ دونوں انسانی سیرت کے بہترین خصائص کے مالک تھے، ملت اسلامیۂ پاک وہند کے دونوں نامور فرزند تھے۔ دونوں نے تاریخ اور اسلامی علوم ومعارف کی بہترین یادگاریں اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ شبلی مرحوم سے دونوں کو تعلق تھا گویا کہ خواجہ تاش تھے۔ ندوہ اور دارالمصنفین کی تحریک سے دونوں کا تعلق تھا۔ سرسید، ان کی تحریک، مدرسہ علی گڑھ، ارباب علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بارے میں دونوں کے خیالات یکساں تھے۔ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے دوست تھے اور دونوں کی دوستی کی یادگار سید صاحب کے نام مولانا مرحوم کے خطوط ہیں۔

غرضے کہ ایک، دوسرے کا واقعی معاصر ہونے کے لیے جن خصائص وکمالات کے اشتراک کی ضرورت ہوسکتی تھی، دونوں میں بہ کمال وتمام موجود تھے۔ دونوں کے افکار، خدمات، سیرت کا موازنہ کیا جائے تو کہیں کہیں صرف درجوں میں فرق ملے گا، دائروں کے اختلاف کا دور دور بتا نہ چلے گا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ دونوں میں اختلاف بھی تھا۔ یہ اختلاف مزاجوں کا تھا۔ طبیعتوں کی افتاد کا تھا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اور حالات کے فرق نے دونوں کی سیرتوں اور طبیعتوں پر بعض گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ اور ذوق پر، ذہن کی کشادگی پر، قلب کی وسعت پر، فطرت کی بلندی پر اس کے اثرات پڑے تھے۔ علمی زندگی میں دونوں کے گردوپیش کے اختلاف اور اس کے مؤثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ دونوں بزرگ ایک ہی دور علم وتہذیب اور عہد تاریخ وسیاست کی نامور شخصیت تھے لیکن دونوں کی طبیعتیں الگ الگ سانچوں میں ڈھلی تھیں۔

دونوں بزرگوں کے ذوق ومزاج اور سیرت وطبیعت کے اختلاف نے ان کے ماننے والوں کو دو مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

یہاں ہمارا مقصد صحیح یا غلط، خوب یا ناخوب کا فیصلہ کرنا نہیں۔ مولف نے اس مضمون میں جن مآخذ سے استفادہ کیا ہے صرف انہی کی حد تک بعض باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس مضمون کی اس حیثیت پر نظر ضرور رہنی چاہیے۔

۱۔ اس میں مکتوبات سلیمانی کی روشنی میں مولانا آزاد کے خلاف سید صاحب مرحوم کے خیالات کو مرتب کر دیا گیا ہے، لیکن سید صاحب کے ان الزامات سے مولانا آزاد کا دفاع نہیں کیا گیا ہے۔ اور

۲۔ مولانا آزاد کے خطوط کی روشنی میں سید صاحب مرحوم کے فضائل و محامد کو مرتب کر دیا ہے۔

اس لیے یہ مضمون بنیادی طور پر مولانا آزاد کے خلاف اور حضرت سید صاحب مرحوم کی مدح میں ہے اور شاید مولانا آزاد کے خلاف ان کے بعض خیالات کی اشاعت کی غرض سے مرتب کیا گیا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کو حضرت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے شکایات تھیں یا محض بدگمانیاں، اس کا فیصلہ تو یہاں نہیں ہو سکتا البتہ سید صاحب کا قلب ضرور رنجیدہ تھا اور وہ آزردہ خاطر تھے۔ نیز مختلف حالات میں ان کے قلب کی رنجش اور طبیعت کی آزردگی میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی اور اس کا اظہار ان کے نجی خطوں اور صحبتوں میں ہوتا تھا۔ اور شاید بعض اوقات بعض صحبتوں اور نجی کی مراسلت سے ان کا رنج اور آزردگی بڑھ جاتی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا آزاد کے تذکرے میں ان کے قلم کا اعتدال اور توازن مجروح ہو گیا تھا۔

۱۔ مولانا آزاد کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب انہیں اپنے اخلاص و محبت کا یقین دلاتے تھے۔ اس کے ثبوت میں سید صاحب کے مضامین پیش کیے جا سکتے ہیں اور مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے نام اور بعض دیگر خطوں میں نہایت طنز و تعریض سے کام لیا ہے۔

۲۔ سید صاحب مرحوم نے اپنی کسی پبلک تحریر میں ابوالکلام کے خلاف ایک لفظ نہیں لکھا لیکن نجی کی تحریروں میں ان کے نہایت زہر آلود فقرے موجود ہیں۔

۳۔ سید صاحب مرحوم نے دار المصنفین کو مولانا آزاد سے بچانے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے اور وہ خود ہی دار المصنفین کے معاملے میں مولانا سے مشورہ کرتے بھی نظر آتے ہیں نیز مولانا کی درخواست کے بغیر ہی انہیں ادارے کی فیلوشپ کے اعزاز سے بھی نوازتے رہے۔

۴۔ ابوالکلام کی ذات سے وہ چڑ کتنے بھی رہے ہوں اور حبیب آزاد مراسلت پر رشک بھی کیا اور نیاز مندانہ تعلقات کی تاریخ کا حوالہ بھی دیا۔

۵۔ وہ صحائف ابوالکلام کی ترتیب و اشاعت کے مشورے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور برا مناتے ہیں لیکن ترجمان القرآن کی اشاعت کی پیش کش بھی خود ہی کرتے ہیں۔

۶۔ ترجمان القرآن وقت کی اہم تصنیف تھی اور اس کی تعریف میں انہوں نے قلم توڑ دیا تھا۔ لیکن مولانا دریابادی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترجمان القرآن کے ذرا بھی قائل نہ تھے۔

۷۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی روایت ہے کہ سید صاحب ترجمان القرآن کے بالکل قائل نہ تھے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ وہ ترجمان القرآن کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔

۸۔ ترجمان القرآن انہیں بالکل پسند نہ تھا، اس میں بھیڑیئے چھپے ہوئے تھے لیکن پہلی جلد کی اشاعت کا وقت "مبارک" کہلایا۔ مصنف ترجمان القرآن کی "دیدہ وری" قابل داد بھی ٹھہری اور اسی نے قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی و وسعت کو نمایاں بھی کیا۔

۹۔ ترجمان القرآن کے مطالعے کا وہ کسی کو مشورہ نہ دیتے تھے لیکن وہ اس کے مطالب کی تالیف میں شریک بھی تھے اور ترجمہ و تفسیر کی درمیانی چیز فٹ نوٹس کا اضافہ تو ان کے بہ قول انہی کے مشورہ و ایما پر کیا گیا تھا۔

۱۰۔ الہلال محض الفاظ کا طلسم تھا لیکن سید صاحب مرحوم ہی کے بہ قول جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں قرآن کا صحیح ذوق مولانا کے الہلال و البلاغ نے پیدا کیا اور ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے۔

۱۱۔ الہلال انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن وقت کی صحافت کا معیار بھی وہی ٹھہرا کہ کوئی پرچہ نکالنے والے کو اس کے عنوانات اور ان کی ترتیب و تالیف سے استفادے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔

۱۔ مولانا آزاد کے سحر زبان اور جادوئے بیان سے رانچی کی شور و سنگستانی زمین پانی

ہوگئی اور وہ بھی شیریں، لیکن مولانا ملیح آبادی ان کی صحبت میں کچھ پانے کے بجائے فکر صحیح اور شرافت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

۱۳- ابوالکلام الفاظ کا محض ایک جادوگر تھا۔ لیکن اسی موثر قلم سے قرآن پاک کی تفسیر کی ضرورت بھی سید صاحب ہی نے محسوس فرمائی تاکہ "مسلمانوں کے لیے نور بینش اور افزائش بصیرت کا سروسامان اردو میں میسر آئے"۔

۱۴- ابوالکلام وقت کا بدترین شخص تھا جو ایمان وذوق عمل کی سعادت سے محروم اور لغویات و منہیات میں مبتلا تھا، لیکن اسوۂ یوسفی کے درجے پر فائز بھی وہی شخص تھا، رانچی کے زمین و آسمان اسی کے پرتو صحبت سے بدلے اور اسی کی ذات تھی جو سید صاحب مرحوم کو ابن تیمیہ، ابن قیم، شمس الائمہ سرخسی اور امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کی مثیل نظر آئی تھی۔

۱۵- ابوالکلام محض ایک جاہل شخص تھا، لیکن سیرت نبوی کی تالیف کے وقت بعض مسائل میں مشورے کا اہل بھی وہی نظر آیا۔

۱۶- مولانا دریابادی کے بقول "سید صاحب مرحوم کو مولانا (آزاد) سے متعدد رنجشیں اور شکایتیں رہیں۔ جن کا اظہار وہ اپنی صحبتوں میں برابر کیا کرتے تھے"، لیکن جب کوئی ان کے رویے کا شکوہ کرتا تھا تو نکتہ چینی کے مقام سے فوراً "نیازمندی" کے مقام پر اتر آتے تھے۔ اپنے تئیں مولانا آزاد کا سب سے زیادہ "حقیقی قدر شناس" بتلاتے تھے اور تعلقات کی توضیح میں مولانا کے خطوط کا سرمایہ پیش کردینا چاہتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے اور سچائی کہاں ہے! سید صاحب مرحوم کے واقعی خیالات کیا تھے؟ انہیں مولانا آزاد کے دوست یا مخالف، مخلص یا نکتہ چیں، معترض یا معترف کس مقام پر رکھا جائے؟ طنز وتعریض کی صورت میں جو کچھ ہمارے سامنے آیا ہے، کیا وہ سید صاحب مرحوم کے واقعی سنجیدہ خیالات تھے یا ان کی زود رنج طبیعت کی تخلیق؟ یا کسی دوست یا بزرگ کا فیضان صحبت تھا؟ [1]

---

[1] مولانا آزاد اور حضرت سید صاحب مرحوم کے تعلقات پر مفصل اور تحقیقی بحث "سید سلیمان ندوی، تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں"، آئی ہے۔

اس موضوع پر کوئی سنجیدہ، علمی، تحقیقی مضمون نظر سے نہیں گزرا، شاید ابھی تک لکھا ہی نہیں گیا۔ سید صاحب مرحوم کے بعض نیازمندوں نے چند مضمون لکھے ہیں لیکن حقیقت کا سراغ کسی نے نہیں لگایا۔ شاید ان کا یہ مقصد ہی نہ تھا۔ جو مضمون یہاں پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی اس نقص سے خالی نہیں۔ اگرچہ فاضل مولف مکتوبات سلیمانی کے ایک ایک لفظ کے مطالعے سے لطف اندوز ہوئے ہیں اور وہ ایک ذمہ دار مصنف اور محتاط قلم کے شخص ہیں، لیکن شاید سید صاحب مرحوم کی عقیدت کے جوش میں مولانا آزاد کی ایک اہم خدمت اسلامی اور رانچی کے انقلاب حالات کے بارے میں ایک اہم بیان نظر انداز کر گئے تھے۔ یہ نظر انداز کردہ بیان مکتوبات سلیمانی کے خط نمبر ۷۳ مورخہ یکم اپریل ۱۹۱۹ء سے لے کر قلابین میں اس کے صحیح مقام پر اضافہ کر دیا ہے۔

اس مضمون کی تالیف کے وقت مولف کے پیش نظر معارف اعظم گڑھ میں مطبوعہ مولانا آزاد کے خطوط تھے۔ چونکہ بیشتر خطوط پر تاریخیں درج نہ تھیں اور معارف کا مقصد ان نوادر علمیہ کو چھاپ کر محض محفوظ کر دینا تھا۔ ان پر تحقیق کرنا اور انہیں مرتب کرنا مقصود نہ تھا۔ اس لیے تمام خطوط بہت بے ترتیب تھے، لازمی تھا کہ اس مضمون میں بھی یہ بے ترتیبی قائم رہتی۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے تبرکات آزاد کی ترتیب کے وقت ان خطوط کو بھی معارف سے اخذ کر لیا تھا اور تاریخ، واقعات اور خطوں کی اندرونی شہادتوں کی روشنی میں مرتب کر کے اس میں شامل کر لیا تھا۔ اس مضمون میں یہ خطوط اسی ترتیب کے مطابق کر دیے گئے ہیں اور اس طرح بعض وہ پیچیدگیاں جو سید صاحب مرحوم کے خیالات کی ترتیب بدل جانے سے پیدا ہو گئی تھیں، دور ہو گئی ہیں، لیکن مؤلف مضمون نے معارف کے جو حوالے درج کیے تھے، انہیں برقرار رکھا ہے تاکہ اگر کوئی صاحب اس ترتیب سے مطالعہ کرنا چاہیں تو یہ ناممکن نہ ہو۔

مضمون کی زیر نظر اشاعت میں بعض ضروری حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے لیکن مؤلف کے حواشی سے انہیں بہ یک نظر الگ پہچان لیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ مضمون کی طوالت کے پیش نظر مضمون کی تمہید میں اور بعض دیگر مقامات پر مضمون کا خلاصہ کر دینا پڑا ہے۔

(شاہجہان پوری)

۷

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ابھی ابھی شائع ہوئے ہیں۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اس مجموعے کا پہلا حصہ موصول ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ان کو پڑھنے کے بعد ہر شخص اتفاق کرے گا کہ ان خطوں کی اشاعت سے علمی اور ادبی سرمایہ میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔ بلاشبہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، جنھیں افسوس ناک کہا جا سکتا ہے لیکن اگر دونوں بزرگ عالموں کے حالات و کوائف پر غور کیا جائے تو ان کے اسباب و وجوہ مل جائیں گے۔ فی الحال میں سید صاحب مرحوم کے خیالات کے علل واسباب سے بحث کرنی نہیں چاہتا، اس وقت میں مکتوبات سلیمانی کے ان اقتباسات کو پیش کرتا ہوں، جن میں مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں اچھی یا بری رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی طرح مولانا آزادؔ کے خطوط کے وہ اقتباسات بھی پیش کروں گا جن میں مرحوم نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ مولانا آزاد کے جس قدر خطوط مجھے مل سکے ان سب کو کھنگال ڈالا مگر کسی میں سید صاحب کا ذکر نہیں ملا، اس لیے یہ اقتباسات صرف ان خطوط سے نقل کر رہا ہوں، جو سیّد صاحب کے نام لکھے گئے ہیں اور معارف میں شائع ہو چکے ہیں [1]

اس مجموعے کا پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کا ہے۔ اس وقت تک سیّد صاحب الہلال کے ادارے میں شامل نہیں ہوئے تھے اور الندوہ میں سب ایڈیٹر تھے۔ مولانا دریابادی نے الندوہ کے لیے مضمون بھیجا تھا، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ الندوہ بند ہونے والا ہے تو مضمون کی واپسی کا تقاضا کیا۔ اس پر سید صاحب نے ان کو لکھا:

"چند روز ہوئے کہ آزاد صاحب نے الہلال کے لیے مضمون مانگا کیونکہ وہ آج کل سخت مصائب خانگی میں مبتلا ہیں اس لیے وہ خود کم لکھتے ہیں۔ میں نے مجموعہ مضامین الندوہ مولانا (یعنی مولانا شبلی) کے سپرد کر دیا، لیکن ان کا قرعۂ انتخاب آپ ہی کے مضمون پر پڑا اور وہ کلکتہ روانہ ہو گیا۔"

---

[1] اب یہ خطوط صحت کے بہترین اہتمام، ترتیب کی خوش نمائی اور حواشی کے مفید اضافوں کے ساتھ ...

دوسرا خط ۲۶ اکتوبر ۱۳ء کا ہے اس وقت مولانا کو الہلال میں مولانا عبدالما
سے "حفظ و کرب" کے متعلق تاریخی بحث جاری تھی، مولانا دریابادی نے سید صاحب
سے اس کے بارے میں ان کی ذاتی رائے معلوم کی۔ موصوف نے پہلے اس کے متعلق اپ
رائے دی، اس کے بعد لکھتے ہیں:

"بہت سے پھول صرف دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں، سونگھنے کے نہیں، مولوی آزاد وہی پھول ہیں۔ افسوس کہ میں علم، سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں، اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا۔ میرا بال بال رانہ ہے اور افسوس ہے کہ اب زیادہ اپنے ضمیر کو مجروح نہیں کر سکتا اور اس لیے پابہ رکاب ہوں اور اس ذخیرۂ اسرارِ مخفی کو اس وقت تک محفوظ رکھتا ہوں جب تک اس کا وقت نہ آئے۔"

تیسرا خط ۱۳ جنوری ۱۴ء کا ہے۔ اس وقت سید صاحب الہلال سے الگ ہو کر پونا کالج جا چکے تھے۔ خاصا طویل خط ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"سنا! آپ کے مولانا ابوالکلام نے مجھ کو ایک رجسٹرڈ خط لکھا کہ ۱۳۰ ہم دیتے ہیں اور دس روپے ماہوار کی ترقی تا ۲۰۰ تمام اسٹاف آپ کے زیرِ نگرانی، نام آپ کا اڈیٹری میں ظاہر رہے گا۔ فوراً چلے آئیے۔"

سید صاحب نے جس خط کا حوالہ دیا ہے، وہ بجنسہٖ حاشیے میں درج کر دیا گیا ہے اس کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں:

بہرحال میں آج اپنے شورشِ قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں، لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے تو بغیر از صبر چارہ نہیں، معلوم نہیں اس خط کا نتیجہ کیا نکلے، ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بھی بدگمانیوں کی نذر نہ ہو۔ تاہم خدائے علیم و بصیر میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت ہر حرف جو لکھ رہا ہوں کس عالم میں لکھ رہا ہوں۔ خدارا یقین کیجیے کہ سچائی اور صداقت، محبت و وداد اور ایک گہرے حزن و ملال کے سوا اور کوئی چیز اس وقت میرے دماغ میں نہیں؛

آپ اگر الہلال بالکل لے لیجیے، جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجیے،

مجھے سوا اس کے اصول و پالیسی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں، میں بالکل آپ پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں، صرف اپنے مضامین دے دیا کروں گا اور کچھ تعلق نہ ہوگا...

سردست آپ تشریف لے آئیں اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں تیس کلکتہ کے مصارف اور انتظام کے لیے ہیں، اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا، یہاں تک کہ دو سو پورے ہو جائیں۔

سید صاحب کے جس خط کا میں نے اوپر اقتباس دیا ہے، اس میں انہوں نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ مولانا آزاد بار بار مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور رنجش کے موجبات پوچھتے ہیں۔ چنانچہ اس خط میں بھی باصرار پوچھا تھا میں نے ایک ایک کر کے مختصراً لکھا اور رجسٹرڈ جواب بھیجا۔ لیکن اب تک آواز ے برنخاست۔ مولانا آزاد نے سید صاحب کی شکایتوں اور اعتراضوں کا تفصیل سے جواب دیا تھا، جسے مولانا دریابادی نے حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ موصوف کو مکمل خط نہیں مل سکا۔ مگر جس قدر ملا ہے وہ بھی بہت طویل اور کافی اہم ہے۔ اس کے ضروری حصے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں جواب خط سے اعتراضات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

صدیقی الجلیل الاعز

میں تو جواب سے مایوس سا ہو گیا تھا، لیکن الحمد للہ کہ آپ نے جواب عنایت فرما کر احسان عظیم کیا، جس وقت خط آیا، میرے گھر میں مرض قدیم کا دورہ شروع ہو گیا تھا اور اب تک ہے۔ پھر باوجود اس حالت کے ایک ضرورت شدید سے دہلی چلا گیا۔ یانکی پور ٹھہرا اور ان اسباب سے جواب میں تاخیر ہو گئی، خواستگار معافی ہوں۔

برادر جلیل واعز! سب سے پہلے تو میں آپ کا سچا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ حسب وعدہ اپنے تمام خیالات ظاہر کر دیے اور اس کے بعد احسان مند ہوں، اس احسان عظیم کے لیے کہ آپ کے اس اظہار خیال سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے خط کو میں نے تین بار پڑھا

اور اس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا۔ نہ اس لیے کہ آپ نے جو کچھ لکھا وہ سب کچھ سچ تھا بلکہ اس لیے کہ اس میں سچ بھی تھا جس کے لیے میرے دل نے گواہی دی اور جو حالت ہمیشہ رہتی ہے اس کے لیے ایک تحریک قوی و مزید ہوگئی۔

آپ نے کل دس باتیں لکھی ہیں۔ ان میں (۱) کچھ تو خاص میری ذات کے متعلق ہیں (۲) کچھ الہلال کی تحریر و مضامین کے متعلق (۳) اور کچھ مالی امانت و خیانت کے متعلق۔

ان میں پہلی قسم بالکل سچ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اس احتساب حق کا اجر اور مجھے توفیقِ عمل دے۔

دوسری قسم کا تعلق جہاں تک ارادہ اور نیت سے ہے پورے یقین کے ساتھ انکار کرتا ہوں۔ علم اللہ کہ آغاز کار سے اس وقت تک کبھی بھی میرا خیال اس شیطنت وابلیسی ادعا کا نہیں ہوا۔ واللہ علی ما اقول شہید مگر ممکن ہے کہ میری تحریروں سے ایسا خیال ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں ذمہ دار ضرور ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

البتہ تیسری قسم سے الحمد للہ کہ بکلی منکر ہوں۔ آپ کو اس بارے میں وہی غلط فہمی ہوئی جس کا مجھے خیال تھا اور یہ تذکرہ آپ نے مولوی عبدالرحمن گیلانی سے غالباً گیا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتداء سے کچھ عجیب طرح کی ہے۔ میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی، لیکن ایسے اسباب جمع ہوئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا۔ پھر میں طرح طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور شاید ہی فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا۔ یہ حالت عرصے تک رہی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس عالم میں کبھی کبھی انفعال و انابت کا قوی دورہ ہو جاتا، لیکن پھر قائم نہ رہتا۔

تقریباً پانچ برس ہوئے ہیں جب بمبئی میں تھا کہ یکایک بعض حالاتِ غم آلود ایسے پیش آئے کہ میری حالت میں انقلاب عظیم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے توبہ و انابت کی توفیق دی۔ میں نے عہد واثق کیا کہ جمیع منہیات سے محترز رہوں گا اور اس کے بعد اوامر پر عمل کروں گا۔

یہ تو آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ میں صوم وصلوٰۃ کا پابند نہیں، لیکن میرے خیال میں ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چاہتا ہوں وہ میسّر نہیں۔

رہی یہ بات کہ آپ لکھتے ہیں کہ تم کیوں لوگوں کو دینی پابندی کی تعلیم کرتے ہو؟ تو یہ سوال صدہا بار خود اپنے دل سے کر چکا ہوں۔ اس کے جواب میں دو باتیں کہوں گا۔ اوّل تو دینی پابندی سے قصور، بمقابلہ الحاد و ترک اعمال دینیہ حتی الامکان اعتقاد و عمل یالاسلام ہے اور اس کا تعلق جہاں تک ارکان و جوارح سے ہے کرتا ہوں۔ دوسرے حق کا اظہار ہر مسلمان کا ویسا ہی فرض ہے جیسے نماز پڑھنا اور گویا عبادت۔ پھر اگر لوگوں سے کہتا ہوں کہ اچھے کام کریں اور حق کو حق سمجھیں تو اپنا ایک فرض ادا کرتا ہوں۔ باقی فرائض میں اگر مجھ سے قصور ہو تو اس کی وجہ سے اس فرض کو کیوں چھوڑوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ ایک شے البتہ مجھ میں ہے اور اس کا ہونا میرے لیے اس درجہ یقینی ہے کہ میرا تمام غم والم اس کو دیکھ کر دور ہو جاتا ہے، یعنی حق کی خدمت کرنے کا غیر متزلزل اور راسخ جذبہ اور اس کی راہ میں فنا ہو جانے کا ناقابل فنا عشق اور آج تین سال سے یہ اس طرح روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے کہ ایک منٹ اور ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی چیز اس پر غالب نہیں آئی ہے اور اس نے مجھے نہیں چھوڑا ہے۔ دنیا کی محبوب سے محبوب شے پر بھی وہ غالب ہے اور پورے وثوق اور اعتقاد کے ساتھ دعویٰ کرتا ہوں کہ کوئی شخص کیسا ہی جاں نثارِ حق ہو مگر انشاء اللہ میں اس سے زیادہ جاں نثار اور مستقل ثابت ہوں گا۔

نیز یہ کہ مجھے خدا پر جو اعتقاد ہے وہ بہت ہی پختہ اور راسخ ہے اور میں مذہب کی نسبت جو کچھ کہتا ہوں دل کے اصلی اور سچے جوش اور یقین سے کہتا ہوں اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو رسماً کہتے ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں کہ مجھ پر کیسے کیسے وقت گزرتے ہیں اور کیسے کیسے خیالات طاری ہوتے ہیں مجھ کو یہی چیزیں روز بروز یقین دلاتی رہتی ہیں کہ خدا مجھ کو پورا تزکیہ اور کامل عمل ضرور عطا فرمائے گا۔ نیز یہ کہ مجھے ضائع نہ ہونے دے گا اور مجھ سے کام لے گا۔

میں متقی اور کامل الاعمال آدمی نہیں ہوں، مگر کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ کیا اس بات کو کہنا چھوڑ دوں جس کو اچھا سمجھتا ہوں؟ اور پھر باوجود اس کے اپنے دلی جوش کو کیسے دباؤں جو خدا جانتا ہے کہ بڑا ہی قوی اور مجھے مبہوت ولایعقل کر دینے والا ہے۔

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا اور اپنے یقین کے خلاف یقین دلانا نہیں چاہتا میرا حال ایسا ہی ہو رہا ہے، میں کیا عرض کروں، کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوئی بیان آج تک نہیں کیا ہے، مذہب وراست بازی خدا پرستی وحق حریت کے متعلق جس کے لیے ایک اصلی جوش اور دل کا ولولہ میرے اندر موجود نہ ہو۔ ولعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

ہاں حال میں ایک شخص کا خط آیا ہے جو جناب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے، میں نے جی میں کہا کہ یہ تو سچ نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ ہے یا غلط؟ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر کیا موقوف ہے میں نے سبھی طرح کی سیہ کاریاں کی ہیں، لیکن الحمدللہ کہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔

الہلال کے متعلق آپ نے جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہ دعوئ الہام وامامت وخود پرستی وتشخص وتحقیر اناس وادعا تبختر وغیرہ وغیرہ۔"

میں نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کہاں کیا ہے۔ اگر دعوی الہام سے مقصود وہ مضامین ہیں جن میں ایک مخصوص طرز تحریر سے خدا پرستی وفدائے حق ہونے کی تعلیم ہے تو تعجب ہے کہ آپ ایسا سمجھیں۔ اگر اس کے معنی ادعاء الہام کے ہیں تو اس طرز کے چند مضامین آپ نے بھی لکھے ہیں جو از سرتا آخر انجیل کی زبان میں ہیں۔

تحقیر اناس سے اگر مقصود بعض خاص اشخاص کی تذلیل ہے تو اس سے آپ بھی متفق ہیں، یعنی ان لوگوں کو جو قوم کو ضرر پہنچاتے اور آزادی کو رد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کسی کی تحقیر کی ہے تو آپ ذرا کھول کر مجھے یاد دلائیے۔ واللہ باللہ میں سچے دل سے توبہ کروں گا اور اس سے بچوں گا۔

آپ نے لکھا ہے کہ تم وہ میں" لکھتے ہو اور اس سے استدلال کیا ہے، لیکن

میں نے بہت غور کیا اور سمجھ نہ سکا کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو "میں" اور "ہم" دونوں لکھتا ہوں۔ بعض موقعوں پر "ہم" تحریر میں اچھا نہیں معلوم ہوتا بہ بنائے انشا و حسن بیان۔ دلیل اس کے لیے نہیں دی جا سکتی تاہم اب اسے چھوڑ دوں گا اور کیا کروں...

حزب اللہ کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے کہ اس سے مقصود صرف اپنی پرستش کرانی ہے تو اس کے جواب میں بھی اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ اگر ایسا چاہتا ہوں اور یہی میرا مقصود ہو تو اللہ اور اس کے ملائکہ کی مجھ پر لعنت۔ تعجب ہے کہ آپ کا ایسا خیال ہے۔ خدا کے لیے تھوڑی سی زحمت اور گوارا کیجیے اور مجھے حوالہ دے کر اور مثالوں کے ساتھ بتلائیے کہ ادعاء نبوت و وحی کا خیال آپ کو کیوں کر پیدا ہوا؟

ایک دفعہ آپ نے چندہ کے متعلق لکھی ہے اور اس کی بنا وہی واقعہ ہے جو میں سمجھا تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے سامنے لوٹ پڑتے دیکھا ہے۔ میں اس غلط فہمی پر بہت متاسف ہوا۔ نیز معاف کیجیے گا، سوء اتفاق پر ہنسا بھی...[1] آپ کے اس بیان سے دل بہت زخمی اور غم گین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں ایسا حرام خور اور اخبث ہو گیا ہوں، لیکن پھر تسکین ہوئی کہ یہ بھی آپ اپنی ایمانی قوت اور راست بازی کی وجہ سے کہتے ہیں[2] آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے خود بھی کچھ روپیہ اپنی حالت کے مطابق طرابلس اور بلقان میں دیا ہے اور سوائے چھ سو یا قریب چھ سو کی آخری قسطوں کے جو مہاجرین کے لیے آئی تھیں اور نہیں گئیں کیوں کہ ایک سو پاؤنڈ کے انتظار میں رہا اور الحمد للہ کہ ایک پائی بھی میں نے اپنے

---

[1] اس مقام پر مولانا نے تفصیل کے ساتھ سید صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کے مکمل خط کا مطالعہ "مکتوبات سلیمانی" جلد اول میں کیجیے۔

[2] یہ حضرت مولانا آزاد کے اخلاق کریمانہ تھے جو اپنے متعلق بدگمانی اور سوء ظن کو مخاطب کی ایمانی قوت اور راست بازی قرار دیا ہے ورنہ سوء ظن ایمان کے بجائے ایک دوسری چیز کی علامت ہے۔

علم میں ضائع نہیں کی اور یہ روپیہ بھی اب پھر سوں چلا جائے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر انصاری کو ایک شخص نے پچاس پونڈ دیئے ہیں اور دونوں شامل چلے جائیں گے۔

آپ کا وقت بہت ضائع ہوا۔ یہ تفصیل میں نے اس لیے نہیں کی کہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو اور مجبور کرنا چاہتا ہوں، کہ آپ آیئے، اللہ کی مرضی ہماری خواہشوں سے بہتر ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں اور آپ کو نیک اور مخلص آدمی یقین کرتا ہوں۔ اسی لیے آپ کے خط نے مجھے بہت متاثر کیا اور جتنا حصہ اس کا سمجھ سکا اور مطابق پایا، اس سے مجھے بہت نفع ہوا۔ بس ان تفصیلات کا لکھ دینا بہتر ہے۔

آپ مجھے نہ بھولیے اور بھلانے کی کوشش نہ کیجیے اور میرے لیے دعا کیجیے صرف یہی دعا جو میں مانگتا ہوں، یعنی خدا تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے اور میری عاجزیوں اور منتوں کو قبول کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو میں گمراہ ہو کر گمراہ کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے دنیا سے اٹھا لے۔۔

مولانا آزاد کا مذکورہ بالا خط بہت ہی صاف اور واضح ہے اور ایک ایک حرف سے خلوص اور صداقت نمایاں ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی غلط فہمی اس سے بھی دور نہیں ہوئی، چنانچہ طنز و تعریض کا سلسلہ اگلے خطوط میں بھی جاری ہے، مگر کم اور ہلکا۔ اس خط کے کوئی ایک سال بعد، ۲۶ جنوری ۱۵ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

مولوی آزاد کا خط آیا ہے اپنے کو ہمارا عنان ظاہر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دار المصنفین کی ایک اسکیم تیار کرلی ہے۔ ضرورت ہے کہ دار المصنفین کو علی گڑھ اور الہلال دونوں سے بچایا جائے۔ علی گڑھ میں جو چیز ہوگی آفتاب احمد خاں واشالہم کے نتیجہ میں ہوگی۔ الہلال کا کام تخیل سے عمل میں کبھی نہ آئے گا (ص ۳۷)

یہاں مولانا عبدالماجد صاحب حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ "مولانا ابوالکلام آزاد سے تعلقات میں تلخی اب تک باقی ہے"، لیکن اس تحریر کے نصف ماہ کے اندر ہی سید صاحب دار المصنفین کے بارے میں چند اکابر سے گفتگو کرتے ہیں تو یہ دیکھ

سر تعجب ہوتا ہے کہ ان میں مولانا آزاد بھی شامل ہیں۔ ۹ فروری ۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "دار المصنفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین، عماد الملک اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں اور مولوی ابوالکلام سے گفتگو کر رہا ہوں، مولوی عبدالحق کو بھی خط لکھا ہے،، (صفحہ ۳۱)

مزید تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہ انیس سال کے بعد سید صاحب الہلال اور البلاغ کے متعلق بڑی شاندار رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت، کمالِ انشاپردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کو پیش کیا، اس نے ان کے لیے ایمان ویقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی ومطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔" (معارف، اکتوبر ۱۹۳۳ء)

بعد کے خطوط میں مولانا آزاد کا اگر کہیں ذکر آیا ہے تو عام طور پر سرسری طور پر، تلخی اگر کہیں ہے تو بہت خفیف۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"البلاغ دیکھا ہوگا، اب تو پہلے سے بھی رنگ زیادہ شوخ ہو گیا ہے۔ علامہ مرحوم کے بعد مشرقی علوم میں اب وہ کس کا ڈر کرتے ہیں۔"

(۱۷ نومبر ۱۹۱۵ء صفحہ ۴۵)

لطیفہ سنیئے، ایک صاحب "صحائفِ ابوالکلام،، کی تہذیب کی خدمت سپرد کرتے ہیں کہ علاوہ فوائدِ مالی دار المصنفین کی شہرت بھی ہے۔"

(۶ ستمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۹)

مولانا دریابادی نے اس ٹکڑے پر نوٹ لکھا ہے کہ "سید صاحب کے اس وقت کے تعلقات کی جو نوعیت مولانا ابوالکلام کے ساتھ تھی، اس کے لحاظ سے یہ فرمائش ایک عجیب ستم ظریفی تھی۔،،

اس مقام پر مکتوبات سلیمانی کا ایک اہم اقتباس مؤلفِ مضمون نے چھوڑ دیا

تھا جو درج ذیل ہے؛

اعظم گڑھ

یکم اپریل ۱۹۱۹ء

مکرم السلام علیکم

والا نامہ ملا۔ میں پورا ایک عشرہ اپنے مرکز سے غائب رہا، رانچی پہنچا، تین برس کے بعد مولانا ابوالکلام کی زیارت ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ بڑی مسرت ظاہر کی۔ خوب خوب صحبتیں رہیں۔ وہ بھی تطبیق معقول و منقول کے دیرینہ ذائقے سے گھبرا گئے ہیں۔ آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے۔ فقہ و عقائد میں، ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک ظاہریت مسلک ہے۔ رانچی کی شور و سنگستانی زمین ان کے سحر زبان اور جادوے بیان سے پانی ہوگئی ہے، وہ بھی میٹھا۔ مدرسہ کی عمارت چھوٹی لیکن خوبصورت اور شان دار بنی ہے لوگ بہت مانتے ہیں۔ ایک دو تقریریں میری ہوئیں۔ .... (صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶)

اس سے ایک مہینہ قبل سید صاحب مرحوم ”سلسلۂ نظر بندانِ اسلام“ کے ذیل میں مولانا آزاد پر ایک نہایت شان دار مضمون لکھ چکے تھے۔ اس مضمون کی آخری سطریں یہ ہیں:۔

”ان سطروں کے لکھتے وقت مجھ کو یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی اور امیر بن عبدالعزیز کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں؟“

(معارف، مارچ ۱۹۱۹ء صفحہ ۲۵۹)

انجمن اسلامیہ رانچی کے دوسرے سالانہ جلسے کے لیے سید صاحب نے پھر سفر کیا اس سفر سے بھی وہ وہی حسن تاثیر لے کر لوٹے رانچی کے اس دوسرے سفر کے بعد رانچی کے انقلابِ حالات اور حضرت مولانا کے حسنِ سیرت کے بارے میں اپنے تاثرات مولانا کے نام ایک خط میں تحریر فرمائے تھے اس کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں؛

”اگر آپ کو قیام رانچی میں میری کوتاہیاں محسوس نہ ہوئیں تو اس سے ان کا عدم نہیں بلکہ آپ کی محبت کا استغراق ثابت ہوتا ہے۔ اس بات نے دل کی ندامت کو اور زیادہ کر دیا۔“

ان سطور کا حوالہ مؤلف مضمون نے بھی دیا ہے۔ ان کے سامنے معارف نومبر ۱۹۵۳ (ص ۳۸۸) تھا۔ میرے سامنے "تبرکات آزاد" ہے۔ لیکن مضمون میں ان سطور کا سیاق بدل جانے سے یہ بالکل غیر موثر ہو گئی ہیں۔]

"پھر مولوی ابوالکلام صاحب نے تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے بھی اس طرز کا رسالہ (مراد قرآنی سیرۃ نبوی) لکھا ہے، شاید عالمِ مثال میں زیرِ طبع ہو"۔ (۲۰ مارچ ۲۰ء ص ۱۱)

مولانا عبدالماجد صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "خود سید صاحب بھی اخیر زمانہ میں مولانا کی طرف سے بڑی حد تک صاف ہو گئے تھے[۱] بلکہ درمیان میں تو ایک دور خاص لطف و محبت کا بھی آگیا تھا[۲]" (ص ۹) مگر حصہ اول کے خطوط سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

اب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطوط کے جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو لکھے گئے تھے، ایسے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے سید صاحب کے متعلق ان کے صحیح خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان اقتباسات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے دل میں سید صاحب کی بڑی عزت اور رفعت ہے اور ان کا خلوص شک و شبہ سے بالاتر ہے، ملاحظہ فرمایئے

"بہرحال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق و ہم عنان یقین کیجیے اور ہر دم خدمت گزاری کے لیے تیار۔ افسوس ہے کہ ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ کاش اللہ یک جائی سکا

---

[۱] سید صاحب کا آخری زمانہ پاکستان میں بسر ہوا تھا۔ اس لیے مولانا دریابادی کو معلوم نہیں کہ سید صاحب مرحوم کا یہ ذوق اس زمانے میں عروج پر تھا۔

[۲] مولانا آزاد کے خطوط کی روشنی میں تو اس دور کو کافی پھیلایا جا سکتا ہے لیکن سید صاحب مرحوم کے حالات اور مولانا دریابادی کی شہادت کی روشنی میں ایسے لطف و محبت کے کسی ایسے دور کا استثنا مشکل ہی ہے۔ جیساکہ اس مضمون کے مؤلف نے خود اس کے بعد جملے میں اعتراف کیا ہے۔

سامان کرتا۔ قوتیں مجتمع ہوتیں۔ تفرق اور عدم توحد نے ان نتائج سے بھی محروم کر دیا ہے جو باایں ہمہ بے سروسامانی حاصل ہو سکتے تھے۔

دار المصنفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور ندوہ کا حقیقی بدل بل نعم البدل۔ اصلی کام وہی ہے باقی سب کے سب فروعی ہیں۔ آپ کی زندگی کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ آدمی پیدا ہوں[1] (معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء)

"دار المصنفین کا پراسپکٹس پہنچا، آپ مجھے اس سلسلے میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے، آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں، بشرطیکہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص۔"[2]

(معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۳۱۱)

"قلی" کے لفظ پر معارف کی طرف سے حسب ذیل نوٹ ہے:

"یہ خط مولانا کی عظمت اور علم دوستی کی بہت بڑی دلیل ہے، اس لیے اس کو بجنسہ شائع کر دیا گیا۔"

کلکتہ۔ ۲۵ر اگست (۱۹۱۵ء)

"اخ الاعز الاجل!
انعم اللہ علی بلقائکم والسلام علیکم

والا نامہ پہنچا، مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ پونہ سے چلے نہ گئے ہوں۔ یہ آپ نے کیوں کر کہا کہ میں آپ کو بھول جاتا ہوں۔ غالباً تواتر و تسلسل مراسلات علائق قلبیہ کے لیے شرط نہیں ہیں۔ آپ یقین کریں کہ موجودہ عہد کے جہل عام اور فساد محیط میں اتحاد مشرب و فکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔۔۔۔۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح کام کو جاری رکھا۔ یہ کام دراصل یوں تھے کہ باہم یک جائی ہوتی اور دیر دیر تک صحبتیں اس بارے میں کی جائیں لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو جس حال میں جو کچھ ہو جائے اور توفیق مساعد ہو اسی پر شکر کرنا

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۱۵ء، تبرکات آزاد میں اس خط کا نمبر ۵ ہے۔

[2] اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے تبرکات میں یہ ساتویں نمبر پر آیا ہے۔

چاہیے.....

اگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے سچ سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے، گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں[1]"

(معارف نومبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱)

اخ الجلیل الاعز   انعم اللہ علی بلقائک

خط پہنچا، ایسی حالت میں کہ آپ کے عدم تعین مکان و عالمِ اطلاق مقام سے سخت پریشان تھا اور حیران تھا کہ کیوں کر خط و کتابت کروں۔

بیچہ ایسی حالت میں بہت سوچتا ہوں لیکن آپ کے سوا کسی کو نہیں پاتا جس سے امید رکھوں۔"

مدت ہوئی جب آپ کلکتہ میں تھے اور ایسے ہی ایک اطلاع ملی تھی، شب کو میں نے اپنے کمرے میں آپ کو بلایا تھا اور آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا خدارا اس کو سامنے لائیے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے وقعت دیجیے:

میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اسی وقت اپنے کاموں میں کوئی تبدیلی کیجیے، البتہ اگر اس کا آپ بذریعہ تحریر مجھ سے وعدہ کریں کہ جب وقت آئے گا تو

---

[1] اس خط پر سنہ درج نہیں تھا۔ اندرونی شہادت کی بنا پر مولانا غلام رسول مہر نے اسے ۱۹۱۵ء کا قرار دیا ہے اور نویں نمبر پر درج کیا ہے۔

[2] اس سے پہلے کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میری فرصتِ موجودہ اب قریب الاختتام ہے اور مشیت الٰہی جس طرح مہلت دے کر کام کرانا چاہتی تھی، اسی طرح آخری ابتلا کو بھیج کر کوئی عظیم الشان مقصد پورا کرانا چاہتی ہے۔ آثار گویا ہیں اور علائم قطعی اخبار موثق اور اطلاعات معتبر تاہم سب کچھ اس کے ہاتھوں میں ہے اور میں نے اس دور حیات میں بڑے بڑے کرشمے دیکھے ہیں۔ پس کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل ٹھیک ٹھیک کیا ہو گا اور وہی ہو جو اس کی مرضی ہے۔ (اعظمی)

آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک کام کے ہو رہیں گے تو میں بڑی ہی تسکین
پاؤں اور اطمینان کے ساتھ آنے والی حالت کو قبول کر لوں، وہ تسکین جو یہ بخشی
سے اور کسی کے پاس نہیں۔

آپ مجھ سے بلا تاخیر بذریعہ تحریر وعدہ کریں کہ اگر میری نسبت آپ کو کوئی بُری
خبر ملے تو آپ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ آپ فوراً کلکتہ آئیں اور البلاغ جو نکل چکا ہے (اور
ان شاء اللہ محفوظ ہے)، اپنی اڈیٹری میں لے لیں اور ایک خالص دینی و اصلاحی رسالے
کی شکل میں مع اس کے خصائص کے اس کو جاری رکھیں کسی پر خطر راہ کے اختیار کرنے
کی ضرورت نہیں، نہ جنگ پر رائے زنی کی ضرورت ہے، صرف قرآن و سنت کے
معارف و دعوت کو بہ اندازۂ اصولِ البلاغ مخصوص جاری رکھنا چاہیے اور جب تک
اس طرح کیا جائے گا اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

یہاں تمام لوگ آپ کے استقبال کے لیے منتظر ملیں گے اور وہ آپ کا اسی
طرح ساتھ دیں گے جس طرح میرا دیتے ہیں اور اسی طرح حکم مانیں گے اور ماتحت
رہیں گے جیسے میرے رہتے ہیں...

البلاغ کے علاوہ بالکل علیحدہ ایک معتدل مسلک کا روزانہ اخبار اقدام
بھی جاری ہوا ہے، وہ بھی آپ کے تحت ہو جائے گا اور ایک بڑا اسٹاف اپنے
ماتحت آپ پائیں گے۔[1]

---

[1] تبرکات آزاد میں مولانا غلام رسول مہر نے اقدام پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے:
"یہ روزانہ اخبار مولوی محی الدین احمد قصوری نے کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ افسوس
کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کا داخلہ مختلف صوبوں میں بند ہو گیا اور مولوی محی
الدین احمد بھی اسے بند کر کے وطن آنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں انہیں نظر بند کر دیا
گیا" (صفحہ ۱۳۴)

مولانا آزاد کے اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن مولانا مہر صاحب اور
خط کے مضمون کی شہادت کے مطابق یہ خط ۱۹۱۵ء کے اواخر یا ۱۹۱۶ء کے اوائل کا
ہے۔ اقدام مولانا آزاد کے اخراج کلکتہ کے تھوڑے عرصے بعد ہی بند ہو گیا تھا۔

امید ہے کہ دار المصنفین وغیرہ اس میں مانع نہ ہوں گے، کیوں کہ اس کو تو ہر حال میں قائم رکھ سکتے ہیں۔ ؎۱

(معارف نومبر ۵۳ء صفحات ۳۸۲ تا ۳۸۴)

صدیقی العزیز

السلام علیکم

معافی کا خواہاں ہوں جواب میں بہت تاخیر ہوئی، لیکن بلا عذر نہ تھی، مولوی مسعود علی صاحب نے از راہ عنایت سیرۃ وغیرہ بھیج دیں، جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ دار المصنفین سے تحائف تو ہمیشہ پہنچتے ہیں لیکن کبھی کوئی بل نہیں آیا، آخر آپ نے کوئی سالانہ، ماہوار فیس تو رکھی ہو گی۔

جلسے کے موقع پر ملاقات کی امید تھی مگر پوری نہ ہوئی۔ الایام وھی کما ھیا، آپ کے ہموم وغموم ؎۲ کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا مجھے یہ تفصیل معلوم نہ تھی، لیکن آپ کی شاعرانہ مایوسیوں سے متفق نہیں ہوں۔ اوائل حوادث میں ایسے ہی احساسات ہوتے ہیں، لیکن فان ماتحذرین قد وقع کے بعد خود بخود طبیعت سکون پذیر ہو جاتی ہے۔ آپ نے لکھا کہ معنوی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، مگر بقول آپ کے معنوی زندگی کے لیے مادی سر و سامان و محرکات ناگزیر ہیں اور نیز بہ قول آپ کے چاک دامنی کے لیے ایام گل کا اشارہ ہو بتدریج خود ہی، طبیعت اس کا انتظام کر لے گی، آپ گھبرائیں نہیں...

معارف کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی جو صرف خدمت علم و تصنیف و تالیف کے

؎۱ اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ تبرکات آزاد میں مولانا مرحوم نے اسے دیویں نمبر پر درج کیا ہے۔

؎۲ غالباً یہ غم دوسری اہلیہ کے انتقال پر تھا۔ مولانا دریابادی کو سید صاحب نے لکھا ہے کہ "بخدا مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ کو اپنی بیوی سے اس درجہ محبت ہے۔" اعظمی

(مکتوبات سلیمانی صفحہ ۶۸)

پلے وقف ہے؟" ؎۲ (معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳)

"آپ کے دلچسپ خط نے پوری ملاقات کا لطف دیا، آپ کو اس قدر جلد اعظم گڑھ کے گوشۂ عافیت سے برداشتہ خاطر نہیں ہونا چاہیے، ساری باتیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ جہاں دلچسپیوں کی شورش ہے، وہاں امن و جمعیت خاطر کہاں۔

آپ نے دار المصنفین کی موجودہ مالی حالت کا ذکر کیا ہے، نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ یہ سب آپ کے قیام و سعی کا نتیجہ ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کے آخر حیات کی امیدیں بار آور ہوئیں۔ لیکن یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ وہاں کے قیام سے اکتا گئے ہیں۔ اگر آپ نے وہاں رہنا چھوڑ دیا تو پھر سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا ایسا انتظام کیجیے کہ سہ ماہے خورد نہ ماہ پارسامی باش" کی اسکیم پر عمل درآمد ہو سکے، مستقل قیام وہاں رکھیے۔ عارضی ہر جگہ"۔ ؎۱ (معارف اکتوبر ۵۳ء، صفحہ ۳۱۴، ۳۱۵)

"صدیقی العزیز

آپ کا خط ینزل الغیث من بعد ما قنطوا کا مصداق تھا۔ جب بہت عرصہ گزر گیا تو مولوی ابو الحسنات کو لکھا، معلوم ہوا وطن میں ہیں۔ اگر آپ کو قیام رانچی میں میری کوتاہیاں محسوس نہ ہوئیں تو اس سے ان کا عدم نہیں، بلکہ آپ کی محبت کا استغراق ثابت ہوتا ہے اس بات نے دل کی ندامت و اعتراف کو اور زیادہ کر دیا۔" ؎۲

(معارف نومبر ۵۳ء، ص ۳۸۸)

؎ اس خط پر بھی تاریخ درج نہیں تھی۔ لیکن مضمون سے ظاہر ہے کہ رانچی میں نظر بندی کے زمانے کا ہے۔ مولانا مہر مرحوم نے تبرکات میں اسے سولھویں نمبر پر جگہ دی ہے

؎۱ یہ خط بھی بلا تاریخ ہے۔ تبرکات میں سترھویں نمبر پر اس خط نے جگہ پائی ہے۔

؎۲ ۱۹۱۹ء کے اواخر میں رانچی کے دوسرے سفر کے بعد سید صاحب کے خط کے جواب میں یہ خط ہے اس پر ۲ جنوری ۱۹۲۰ء کی تاریخ اور رانچی (بہار) مقام درج ہے اس کا مطلب ہے کہ مولانا اس تاریخ تک رہائی کے بعد رانچی سے روانہ نہیں ہوئے تھے۔ تبرکات آزاد میں یہ خط پچیس ویں نمبر پر درج ہے۔

"صدیقی العزیز،

ترجمان القرآن کی پہلی جلد کسی نہ کسی طرح چھپ کر نکل گئی، آپ کو اس لیے نہیں بھیجی گئی کہ خیال تھا کلکتہ سے مجلد نسخے آجائیں تو بھجواؤں لیکن آج تار سے معلوم ہوا کہ دو ہفتے کی مزید دیر ہوگی۔ ادھر پولیٹیکل حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کتنے دنوں بلکہ گھنٹوں تک جیل سے باہر رہ سکوں گا اس لیے طبیعت نے تقاضا کیا کہ غیر مجلد ہی بھجوا دوں۔"[1]

(دہلی، دریا گنج۔ مورخہ ۷ ۱/۳۲، معارف جنوری ۵۶ء ص ۱۷)

"آپ نے ترجمان القرآن جلد دوم کی اشاعت کے لیے جو آمادگی ظاہر کی ہے۔ یقین کیجیے اس سے میرا دل نہایت درجہ متاثر ہوا۔ یہ محبت و اخلاص کا بڑا سے بڑا ثبوت ہے، جس کا میں آپ سے متوقع ہو سکتا تھا۔ فعلاً یہ بات ظہور میں آسکے یا نہ آسکے لیکن میرے دل پر آپ کی محبت کا نقش ثبت ہو گیا۔۔

جی چاہتا تھا آپ سے ملاقات ہو، دیکھیے اب کب ہوتی ہے۔[2]

جناب کی نئی غزلیں شائع ہوئیں۔ صرف خبر سنی، آج کل کوئی پرچہ نہیں منگواتا۔"[3]

(معارف دسمبر ۵۳ء ص ۴۵۹)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مولانا ابو الکلام آزاد کے ۳۸ خطوط بھی معارف میں شائع ہوئے ہیں۔ فاضل مدیر معارف نے لکھا ہے۔ "بعض اور خطوط بھی علمی و ادبی حیثیت سے اہم اور قابل اشاعت تھے مگر وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئے ہیں کہ پڑھے نہیں جا سکتے"، مولانا دریابادی نے مکتوبات سلیمانی جلد اول میں مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ خط شائع کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسے اہم خط کچھ اور

---

[1] تبرکات میں اس خط کا مقام ستائیسواں ہے۔

[2] اس خط کی تاریخ تحریر ۲ جنوری ۱۹۳۲ء ہے اور تبرکات میں اٹھائیسویں نمبر پر درج ہے۔

[3] یہ سطر تبرکات میں نہیں ہے۔

ہوں جو مصلحتاً شائع نہ کیے گئے ہوں۔ بہرحال اوپر میں نے جو اقتباسات پیش کیے ہیں وہ معارف کے انہی ۳۸ خطوط میں سے ہیں ان سے نہ صرف مولانا آزاد کے خلوص، محبت اور تعلق خاطر کا پتا چلتا ہے، جو سید صاحب سے ان کو تھا۔ بلکہ ان کی غیر معمولی شرافت، طبیعت کی بلندی اور شخصیت کی عظمت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مولانا عبد الماجد صاحب کی ریڈیو کی تقریر ۲۲ر نومبر کے صدق جدید میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مولانا نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "وہ نظریاتی اختلاف، کیا دینی اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا، وہ ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخالفت میں تبدیل ہونے دیا" یہ اس شخص کا حال تھا، جو مولانا دریا بادی کے الفاظ میں "اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حسِ دینی پر پڑی تو چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر، اب سماں ہی دوسرا ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، دلائل کی خطابت کی، آگ برسا رہا ہے اور زبان ہے کہ ایک پھر صدا لگائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغِ جوہر دار"

عبدالحق اور ابوالکلام آزاد

ابو سلمان شاہجہانپوری

مولوی عبدالحق اپریل ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے، اور مولانا ابوالکلام اگست ۱۸۸۸ء میں۔ اس طرح دونوں کی عمروں میں ۱۸ برس سے زیادہ فرق تھا۔ یہ فرق صرف عمر ہی کا نہ تھا بلکہ تعلیم و تربیت، مزاج و کردار، افکار و عقائد اور انداز فکر و نظر، طریق عمل اور زندگی کے مقاصد میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن چونکہ دونوں مرحومین کی علمی و عملی تگ و دو کا میدان ایک ہی ملک ایک ہی قوم اور ایک ہی معاشرہ تھا اس لیے دونوں کی علمی و فکری اور عملی راہیں قریب قریب بھی رہی ہیں، اتنی قریب کہ بعض اوقات بُعد کا تصور مٹ جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق اور مولانا آزاد کے قرب و بُعد، وصل و فصل اور اتصال و انفصال کی کہانی دلچسپ ہے لیکن ہم یہاں صرف اردو کے تعلق سے دونوں بزرگوں کے فکر و عمل اور اس بنا پر دونوں کے قُرب و بُعد اور اختلافات و شکایات کو حقائق کی روشنی میں دیکھیں گے۔

مولوی صاحب مرحوم کو زندگی بھر اردو سے جو والہانہ اور جذباتی لگاؤ رہا وہ ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے۔ ۱۹۱۲ء سے پہلے انجمن ترقی اردو کوئی مستقل اور آزاد ادارہ نہ تھی بلکہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صرف ایک شعبے کی حیثیت تھی۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں ہند پاکستان میں اردو کے کام کی اہمیت کو محسوس کر کے اسے ایک مستقل ادارے کی حیثیت دے دی گئی اور مولوی عبدالحق مرحوم کو ان کی اردو اور اس کی ترویج و اشاعت میں دلچسپیوں کی بنا پر اس کا سکریٹری بنایا گیا، اس وقت سے مولوی صاحب اور اردو لازم و ملزوم ہو گئے۔ مولوی صاحب کا تصور اردو اور انجمن ترقی اردو کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور اردو یا انجمن ترقی اردو کا ذکر مولوی صاحب کی یاد کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا اردو سے تعلق قدیم بھی تھا اور مستقل بھی۔ وہ اردو کے بے مثال خطیب اور صاحبِ طرز ادیب اور عظیم انشاء پرداز ہی نہ تھے، انھوں نے ہند پاکستان میں اردو کی اہمیت کو اس وقت سمجھ لیا تھا جب وہ عمر کے لحاظ سے صرف پندرہ سال کے تھے۔ ابوالکلام کی ادبی زندگی کا آغاز اگرچہ ۱۰-۱۱ سال کی عمر سے ہوگیا تھا۔ اور پندرہ سال کی عمر میں وہ ملک کے متعدد علمی و ادبی پرچوں میں لکھنے لگے تھے بلکہ چند پرچوں کو ایڈٹ بھی کر چکے تھے اور علمی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے لیکن ان کی باقاعدہ علمی و ادبی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب انھوں نے کلکتہ سے "لسان الصدق" نکالا۔ یہ ۱۹۰۳ء کے اواخر کا واقعہ تھا۔ لسان الصدق کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے برصغیر ہند پاکستان کے سماجی اور علمی ماحول کو سمجھ لیا ہے، اس کے تقاضے اور ضرورتیں ان کے علم میں ہیں، اور ان کی اہمیت کا نہ صرف احساس بلکہ عمل کا جذبہ بھی ہے۔ ان کی راہ متعین اور نصب العین واضح و معلوم ہے۔

لسان الصدق کا پہلا پرچہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو مولانا آزاد کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس کے صفحۂ اول سے صفحہ دس تک لسان الصدق کے دستور العمل اور مقاصد کی تشریح کی ہے۔ یہی وہ پہلا مقام ہے جہاں مولوی صاحب اور مولانا مرحوم کی راہ ایک ہے، نصب العین، انداز فکر اور طریق کار میں بھی کامل ہم آہنگی اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ اس وقت دونوں بزرگ ایک ہی امام کے مقتدی، ایک ہی رہنما کے مقلد اور ایک ہی پیر کے مرید تھے، یہ امام، رہنما اور پیر سرسید احمد خاںؒ تھے۔ مولوی صاحب مرحوم کو سرسید کے تمام افکار و نظریات سے جو تعلق اور ان کی ذات سے جو عقیدت زندگی بھر رہی ہے وہ معلوم و مشہور ہے اور محتاج بیان و تشریح نہیں۔ مولانا آزاد کو اگرچہ بعد میں سرسید اور ان کی تحریک سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا لیکن وہ دور جب کہ لسان الصدق جاری کیا تھا، سرسید سے ان کی عقیدت و ارادت کے شباب کا زمانہ تھا مولانا آزاد اپنی آپ بیتی "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں فرماتے ہیں:

"لسان الصدق کا زمانہ سرسید مرحوم کی تقلید و اتباع کی سرمستی کا زمانہ تھا، طبیعت میں ان کی عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی آواز جس میں ایک شائبہ اختلاف یا تنقیص ہو طبیعت کو گوارا نہ تھی۔ سرسید مرحوم کے ساتھ ان کا حلقہ یا اس وقت میری اصطلاح کے بموجب "نورتن" بھی اسی درجہ محترم تھا جس قدر سرسید۔ اسی زمانے میں "حیاتِ جاوید" پر شیخ عبدالقادر نے مخزن میں نقد لکھنا شروع کیا تھا اور عبارت و مطالب دونوں پر چند اعتراضات کیے۔ اعتراضات بہت ہلکے اور دھیمے لہجے میں تھے، اور اس کے مقابلے میں فی الحقیقت گویا کچھ نہ تھے جتنے ہونا چاہیے تھے۔ ایک اور ریویو جس میں تھوڑی سی نکتہ چینی مذہبی عقائد کے متعلق کی گئی تھی، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا تھا جو پہلے شاید علی گڑھ گزٹ میں نکلا تھا اور پھر ایک رسالے کی شکل میں چھپ گیا تھا۔ اس میں ویسے تو کتاب کی بہت تعریف کی تھی لیکن یہ لکھا تھا کہ سرسید کے مذہبی کاموں کی نسبت بے لاگ رائے نہیں دی گئی ہے۔"

"اس وقت مجھ پر یہ دونوں ریویو بہت شاق گزرے اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا ایک بہت بڑی جناب میں گستاخی کی گئی ہے، میں نے لسان الصدق میں حیاتِ جاوید کے ریویو کا ایک سلسلہ شروع کیا اور اس میں پہلے ان نکتہ چینیوں کا رد بڑے جوش و خروش سے کیا تھا، بعض اخبارات نے اس کی تائید کی بعض نے مخالفت اور ایک نئی بحث اس طرح چھڑ گئی۔۔۔۔۔۔
لسان الصدق مولانا حالی مرحوم کے یہاں بھی جاتا تھا، اس وقت تک سرسری خط و کتابت میں نے ان سے کی تھی، انھوں نے یہ ریویو پسند کیا اور میری ہمت افزائی کی۔" ص ۲۹۹

مولوی صاحب مرحوم فکر و نظر میں سرسید کے متبع و مقلد اور ان ہی کے عقیدت مند

نہ تھے، انھیں مولانا حالی سے بھی بڑی عقیدت تھی اس لیے انھیں لسان الصدق کے ایڈیٹر سے تعلق خاطر ہونا لازمی تھا، اس سبب کے علاوہ لسان الصدق اور مقاصد اجراء بھی مولوی عبدالحق کی خاص دلچسپی کی چیز تھے، مولانا آزاد کے الفاظ میں لسان الصدق کے چار مقاصد تھے:

"۱- سوشل ریفارم: یعنی مسلمانوں کی معاشرتی اور رسومات کی اصلاح کرنی۔

۲- ترقی اردو: یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔

۳- علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں۔

۴- تنقید: یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔"

یہ تمام مقاصد مولوی صاحب کی زندگی کا نصب العین رہے ہیں، ترقی اردو اور علمی مذاق کی اشاعت کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ رات دن اسی دھن میں لگے رہے یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، اسی کی خاطر انھوں نے اپنوں کو بیگانہ بنا لیا، اس کی خاطر کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جانے پر نہ صرف مستعد رہے بلکہ گئے، انھوں نے اپنی زندگی کی ایک وضع قائم کر لی تھی، اور زندگی بھر اس وضع کو نبھایا لیکن اردو کی خاطر بہت سے مواقع پر اپنی وضع داری کو بھی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ اردو ان کی کمزوری بن گئی کسی کو اردو کا شیدائی اور کارکن بنا کر مولوی صاحب کا محبوب بنایا جا سکتا تھا اور اردو کے کسی محب کو اردو کا دشمن اور مخالف بیان کر کے ان کے دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا کی جا سکتی تھی یہ بات صرف کلیہ ہی کی حد تک صحیح نہیں بلکہ عملی طور پر بعض لوگوں نے مولوی صاحب کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا، کسی سے انھیں متنفر کیا، اور کسی کو ان کے دل سے قریب لے آئے۔

ہمارے علم میں اس دور کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جسے ہم مولانا آزاد اور مولوی صاحب کے تعلقات کی بحث میں پیش کریں اور یہ ثابت کریں کہ ۴-۱۹۰۳ء میں دونوں بزرگوں میں روابط و تعلقات تھے لیکن ہمارا یقین یہی ہے کہ مولوی صاحب اور مولانا آزاد

میں روابط اسی وقت قائم ہوئے ہمارے اس یقین کو اس چیز سے اور بھی تقویت ملی ہے کہ لسان الصدق کو انجمن ترقی اردو کا ترجمان بنا لیا گیا تھا، اس کے ذریعے سے ترقی اردو، تنقید، سوشل ریفارم سے متعلق اور علمی مذاق کی اشاعت کے لیے مضامین ہی نہ شائع ہوتے تھے بلکہ ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کی شاخ انجمن ترقی اردو کی کارگزاریوں کی روئیدادیں، مراسلے، خبریں، فیصلے اور کاموں وغیرہ پر تبصرے بھی اسی میں شائع ہوتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی اس وقت انجمن کے سکریٹری تھے، ان کے متعدد مراسلات اور کارگزاریوں کی روئیدادیں لسان الصدق کے ۴-۱۹۰۳ء کے پرچوں میں چھپی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد انجمن ترقی اردو کی پہلی انتظامیہ کے رکن بھی تھے۔ لسان الصدق کے پہلے نمبر کے صـ ۱۳ پر "انجمن ترقی اردو" پر ایک نوٹ ہے، اور اس کے نیچے مولانا آزاد کا نام اس طرح لکھا ہے "ابوالکلام آزاد دہلوی، ایڈیٹر لسان الصدق و رکن انتظامی انجمن ترقی اردو" لسان الصدق کے بارے میں مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو قائم ہو چکی تھی اور مرحوم مولانا شبلی اس کے ناظم تھے، انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے خط و کتابت کی تھی، اور انھوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا شائق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا۔ دوسری شاخ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاح رسوم کی قائم کی تھی اور "عصر جدید" نکالا تھا۔ اس میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ لسان الصدق کے خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گئے، یعنی ترقی اردو اور اصلاح رسوم۔ اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اس کی دلچسپی دیکھ کر اسے اپنا آرگن قرار دے دیا تھا، اور مولانا مرحوم انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دلچسپ باتیں ہوتی تھیں، انھیں سب سے پہلے اس میں اندراج کے لیے بھیج دیتے تھے، اور تمام ممبران انجمن کے نام ایک اطلاع شائع کر دی تھی کہ

اس پرچے کو ضرور منگوائیں اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہوگئی تھی۔"

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۹۸)

یہ تمام وہ باتیں ہیں جن سے مولوی صاحب کو گہرا تعلق اور دلچسپی تھی۔ اس لیے ناممکن ہے کہ لسان الصدق اور اس کے ایڈیٹر سے مولوی صاحب کا تعلق و ربط نہ رہا ہو اور تعجب نہیں کہ مولوی صاحب بھی لسان الصدق کے خریدار رہے ہوں۔

نومبر ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۰۵ء تک کے لسان الصدق کے جو پرچے نظر سے گزرے ہیں ان میں مولوی عبدالحق مرحوم سے متعلق کوئی بات نہیں ملی جو ابوالکلام سے تعلق و ربط کے ثبوت میں پیش کی جا سکے۔

بہرحال لسان الصدق کا زمانہ وہ تھا جس میں مولوی صاحب اور مولانا مرحوم کی راہ، مقصد اور نصب العین ایک تھا، دونوں سرسید کی عقیدت سے سرشار، ان کے پرستار اور ان کے کاموں کو آگے بڑھا رہے تھے۔ دونوں ایک ہی تحریک کے کارکن تھے۔

۱۹۰۵ء کے بعد مولوی عبدالحق اسی راہ پر بڑھتے چلے گئے، اردو کی ترویج و اشاعت سے ان کی دلچسپی بڑھتی گئی، انجمن ترقی اردو کے وہ ایک معروف کارکن بن گئے اور ۱۹۱۲ء میں جب انجمن ترقی اردو کو ایک مستقل ادارے کی شکل دی گئی تو مولوی صاحب مرحوم کو اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ مولوی صاحب انجمن کے دفتر کو علی گڑھ سے اورنگ آباد لے گئے اور اس وقت سے انجمن کے کاموں اور اردو کی ترقی کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا وہ ملازمت کی مصروفیتوں کے بعد اپنا سارا وقت انجمن کے کاموں میں صرف کرنے لگے۔ لیکن اس مدت میں ابوالکلام کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب آچکا تھا، سرسید کی عقیدت کا دور ختم ہو چکا تھا، مذہبی معاملات میں تقلید سے نجات سرسید کے طفیل پائی تھی لیکن پھر سرسید کی تقلید سے بھی نکل گئے۔ انھوں نے تعلیمی، سیاسی اور سماجی مسائل پر آزادانہ غور و فکر کا جو اصول و طریقہ سرسید سے سیکھا تھا اسی اصول و طریقہ سے سرسید کے افکار و نظریات پر بھی نظر ڈالی۔ انھوں نے اصول و کلیات کا سرمایہ سرسید کے علوم و معارف سے اخذ کیا تھا لیکن جب

انھیں اصول و کلیات پر سرسید کے علوم و معارف کو پرکھا تو یقین و اطمینان کی جو دولت انھوں نے اسی مدرسۂ فکر میں پائی تھی وہ ہاتھ سے جاتی رہی ۔ مولانا آزاد نے اپنی کہانی میں نہ صرف اشارات میں بلکہ تفصیل سے سرسید سے تاثر، سرشاری اور پھر نقشہ اتر جانے کے بعد کی کیفیت بیان کی ہے ۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا تو سرسید کے مکتبہ فکر سے اس کا کوئی بنیادی تعلق اور ربط نہ تھا، الہلال اس فکر اور تحریک کا سب سے بڑا نکتہ چیں اور مخالف تھا، الہلال کی اپنی مستقل فکر تھی وہ خود ایک تحریک کا بانی تھا، اور اس نے جس درجے اپنے دور کی علمی، تعلیمی، سماجی، سیاسی اور مذہبی تحریکات کو متاثر کیا اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی ۔ لیکن ترقی اردو کے بارے میں ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی ۔ الہلال انجمن ترقی اردو کا باضابطہ نہ سہی، لیکن ترجمان ضرور تھا ۔ مولوی عبدالحق نے جو اس وقت انجمن کے سکریٹری تھے، الہلال کو انجمن کے کاموں اور مقاصد کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنایا ۔ اور ٹھیک اس سے وہی کام لیا جو خود مولانا آزاد نے لسان الصدق سے لیا تھا ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو سے متعلق مراسلات، اطلاعات اور روئیدادیں وغیرہ الہلال میں برابر چھپتی رہیں ۔

یہ دور مولوی صاحب اور مولانا آزاد کے تعلقات و روابط کا دوسرا دور تھا ۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بجز ایک مسئلہ اردو کے باہر معاملے میں دونوں مرحومین کی راہیں ایک دوسرے سے متضاد تھیں ان حالات میں ظاہر ہے کہ گہرے روابط اور دوستانہ تعلقات قائم نہیں ہو سکتے تھے یا باقی نہیں رہ سکتے تھے ۔

اگرچہ مولوی صاحب سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن اس سے انکار نہیں کہ ان کی ساری دلچسپیاں اور ہمدردیاں ان ہی تحریکات سے وابستہ رہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے سوتے سرسید کے افکار و نظریات سے پھوٹے تھے ۔ لیکن اُردو کی خاطر انھوں نے ملک کی سیاسی اور غیر سیاسی تحریکوں اور اشخاص سے تعلق ہمیشہ رکھا اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو بھی انجمن کے کارکنوں میں اور انجمن کے سرپرستوں میں رکھا ۔ ان ہندو کارکنوں،

سرپرستوں اور انجمن کے بہی خواہوں میں کچھ تو صرف علمی اشخاص اور مورخ تھے سیاسیات سے انھیں دلچسپی ہی نہ تھی یا دلچسپی تھی تو وہ سیاست میں حصہ لے کر اردو کے محاذ اور مقدمے کو کمزور نہ بنانا چاہتے اور بعض لوگ ایسے تھے جن کی ہمدردیاں قطعی طور پر کانگریس کے ساتھ تھیں لیکن ان تمام کارکنوں اور سرپرستوں نے جن کے سیاسی خیالات کچھ بھی ایسے ہوں اور کسی جماعت سے یا کسی نظریۂ سیاست سے ان کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں رہی ہوں۔ انجمن کو سیاست کے خارزار سے علاحدہ ہی رکھا اور بجز ایک دو مثالوں کے جن میں انجمن کے بعض لوگوں نے اپنی ذاتی دلچسپی اور رجحان کی بنا پر بعض خالص سیاسی معاملات میں انجمن کے نام کو ایک خاص جماعت کے حق میں استعمال کیا، اس قسم کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ محض سیاسی اختلاف یا ذاتی پسند اور ناپسند کو اردو کا حق منوانے اور اس کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں رکاوٹ بننے دیا گیا ہو۔

چنانچہ حالات شاہد ہیں کہ مسلم لیگ کی طرف مولوی صاحب کے ذاتی رجحان کے باوجود کانگریس کے تمام بڑے بڑے لیڈروں سے انھوں نے تعلقات رکھے۔ اور یہ تعلقات محض رسمی اور اردو کے معاملے میں ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر نہ تھے بلکہ ذاتی تعلقات اور دوستانہ مراسم تھے۔ اور یہ لیڈر چند مسلمان اور باقی سب ہندو تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے مولوی صاحب کے تعلقات سیاسی اُتار چڑھاؤ کے ہر دَور میں رہے۔ دلّی، کلکتہ اور دیگر مقامات پر دونوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اور صرف اردو کے معاملے میں ضرورتاً ہی نہیں ملتے تھے بلکہ دوستانہ قسم کی اور بے تکلف ملاقاتیں ہوتی تھیں، اور خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ خط و کتابت ضرورتاً اور کسی نہ کسی مسئلے میں تبادلۂ خیالات و اطلاعات یا کسی سوال کی ضرورت کی بنا پر ہوتی تھی لیکن انداز کبھی کاروباری نہیں رہا۔ بلکہ ذاتی تعلق، شخصی مراسم اور ایک دوسرے کے ذاتی حالات سے دلچسپی اور اخلاص و محبت آمیز طرز تخاطب سے یہ خطوط آراستہ ہیں۔

کانگریس کے حلقے میں اردو سے متعلق جو کوششیں کی جاتی رہی ہیں ان میں مولوی صاحب کو

جو دخل تھا ان سے سبھی واقف ہیں اس سلسلے میں مولانا آزاد سے خط و کتابت بھی ہوئی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ اردو کے مسئلے کو سلجھانے کی مولانا آزاد نے اندر رہ کر ہی کوشش نہیں بلکہ اردو کے لیے تحریک چلانے میں انھوں نے انجمن ترقی اردو اور بعض دیگر نیم سیاسی اور مذہبی و سماجی جماعتوں اور کارکنوں کی رہنمائی بھی کی، مولوی صاحب نے مولانا آزاد کی رائے کو ہمیشہ اہمیت دی اور مولانا نے مولوی صاحب کی آرا کی قدر کی۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا آزاد نے صوبوں کی حکومتوں کو ہندستانی کے بارے میں جو سرکلر بھیجا تھا وہ مولوی صاحب مرحوم کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جولائی ۱۹۳۸ء کے رسالہ اردو میں "مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندی" کے عنوان سے مولوی صاحب فرماتے ہیں:

"اپریل کے آخری ہفتہ میں جب میں کلکتے میں تھا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، اور یہ عرض کیا کہ کانگریسی حکومتوں کے اکثر ارکان اور وزرا اپنی سرکاری اور غیر سرکاری تقریروں اور تحریروں میں ہندی کی اشاعت پہ زور دے رہے ہیں، اور یہ کانگریس کے فیصلے کے صریحاً خلاف ہے۔ خصوصاً جب اس قسم کے الفاظ کسی حکومت کے وزیرِ تعلیم کی زبان اور قلم سے نکلتے ہیں تو اس سے سخت غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کانگریس حکومت اردو کے مٹانے اور ہندی کے رواج دینے کی کوشش کر رہی ہے چوں کہ آپ کی رائے اس معاملے میں کانگریس کے حلقوں میں مستند سمجھی جائے گی لہٰذا اگر آپ ان کو ہدایت فرمادیں گے تو مناسب ہوگا۔ مولانا نے وعدہ فرمایا کہ وہ گشتی چھٹی کے ذریعے سے اس کی اصلاح فرمادیں گے لیکن غالباً انھیں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا یا بھول گئے۔ اس لیے میں نے انھیں خط لکھا اور اس وعدے کی یاد دہانی کی۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے ساتوں صوبوں کے وزیرِ اعظموں کے نام خط لکھے اور ہندی اور اردو کی بجائے "ہندستانی" کے استعمال کی ہدایت کی۔" (صفحہ ۶۸۹-۶۹۰)

مولانا آزاد اور مولوی عبدالحق کے تعلقات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۴۷ء

یں جب دلّی میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی ـــــ تو مولوی صاحب دلّی سے باہر تھے۔ یہاں چند دن میں زمین و آسمان بدل گئے۔ مسلمان اپنے وطن میں بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی، اور جس شاہجہان آباد کی سڑکوں پر کبھی جمنا کے پانی سے چھڑکاؤ ہوتا تھا اور صاحبِ قران کی سواری کا جلوس شاہانہ گزرتا تھا ان پر مسلمانوں کا خون بہایا گیا، اور ان کی لاشوں کا کوئی اٹھانے والا نہ تھا۔ نفسا نفسی کا عالم تھا کسی کو اپنے سر پیر کی خبر نہ تھی مولوی صاحب کہاں جاتے اور کہاں ٹھہرتے؟ کچھ خبر نہ تھی کہ کون اپنی جگہ پر ہوگا اور کس کا گھر محفوظ رہا ہوگا۔ لیکن جب مولوی صاحب نے دوستوں سے پیچھا چھڑایا اور سفر پر آمادہ ہوئے تو یہ مسئلہ ہرگز رکاوٹ نہیں بنا کہ کدھر کا رُخ کیا جائے اور کس کے یہاں ٹھہرا جائے۔ مولانا آزاد کے یہاں انھوں نے ٹھہرنے کا ارادہ کیا اور مولانا نے بخوشی ان کے قیام کو منظور کر لیا۔ مولوی صاحب مرحوم فرماتے ہیں :۔

"میں حیدرآباد میں پڑے پڑے گھبرا گیا تھا، اور دلی جانے کے لیے بے چین تھا۔ آخر ۲۴؍ اکتوبر کو بھوپال روانہ ہو گیا وہاں سے میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری اجمل خان صاحب کی خدمت میں خط لکھا کہ میں آنا چاہتا ہوں لیکن وہاں ٹھہرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا اگر مولانا اجازت دیں تو چند روز ان کے دولت کدہ پر قیام کروں بعد میں کوئی اور انتظام کر لوں گا ان کا جواب آیا کہ مولانا نے بخوشی میرے قیام کی اجازت دے دی ہے۔ ۸؍ نومبر کو سید علی شبّر حیدرآباد سے دلّی روانہ ہو گئے اور میں ۹؍ نومبر کو۔ ہم مولانا کے مہمان رہے۔" (پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۱۷۸)

مولوی صاحب نے تقریباً ایک ہفتہ قیام کیا پھر انھیں ایک دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ خود تحریر فرماتے ہیں :۔

"میں اور علی شبّر تو مولانا کے ہاں پہلے ہی سے مہمان تھے، دو روز کے بعد رفیق الدین احمد بھی آگئے۔ اب ہم تین ہو گئے، میں نے وہاں قیام زیادہ مناسب نہ سمجھا۔ ایک ہفتے کے بعد ہم نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس (مہمان خانہ) میں اُٹھ گئے۔"

(پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو صـ ۱۸۲)

ظاہر ہے کہ یہ اٹھ جانا اس لیے نہ تھا کہ مولوی صاحب مولانا پر بار ہو گئے تھے یا مولانا ان کے قیام سے اکتا گئے تھے بلکہ وجہ یہ تھی کہ تعلقات مولانا سے مولوی صاحب کے تھے مولوی صاحب کے لکھے مولوی صاحب کے دوسرے ساتھیوں سے مولانا کے تعلقات نہ تھے لیکن ان کے لیے کوئی دوسری جگہ نہ تھی انھیں بہر حال مولوی صاحب کے ساتھ ہی ٹھہرنا تھا۔ مولوی صاحب نے یہ بات مناسب نہیں سمجھی کہ اپنے ساتھیوں کو دوسری جگہ ٹھہرادیں اور خود وہیں ٹھہرے رہیں اور نہ یہ گوارا کیا کہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ جو مولانا کے لیے بالکل اجنبی ہیں وہیں قیام رکھیں۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اخلاقاً دوسری جگہ قیام کا بندوبست کر لیا لیکن ملاقاتوں اور صلاح و مشورے کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن چند دن کے بعد انھیں نظام گیسٹ ہاوس بھی چھوڑنا پڑا۔ مولوی صاحب پاکستان تشریف لے آئے۔ یہ واقعہ اواخر نومبر ۱۹۴۷ء کا ہے۔

پاکستان میں مولوی صاحب کے دوست اور محبان اردو پہلے سے منتظر تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مولوی صاحب یہیں آجائیں اب جب کہ وہ آ گئے تو فوراً کل پاکستان انجمن ترقی اُردو قائم کر کے انجمن کی تمام شاخوں کو منظم کر لیا گیا۔ تقسیم ملک کے بعد اس علاقے کی شاخوں کا مرکز سے جو ہندوستان میں تھا کوئی تعلق نہ رہ گیا تھا ترقی اردو کا کام معطل تھا اور کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا نہ تھا۔ ۱۳ر جنوری کو مولوی صاحب دوبارہ دہلی روانہ ہو گئے لیکن اس مرتبہ چونکہ زاہد حسین صاحب کے ساتھ قیام تھا اس لیے جب مارچ میں ان کا تبادلہ ہو گیا۔ تو مولوی صاحب کو بھی دہلی چھوڑنی پڑی۔ اس مرتبہ بھی دہلی میں قیام کے دوران انجمن ترقی اُردو کے کاموں اور آیندہ پروگرام کے بارے میں مولانا آزاد سے ملاقاتیں اور گفتگو ہیں رہیں۔

۵ر مارچ ۱۹۴۸ء کو مولوی صاحب نے ہندوستان چھوڑا تو اکتوبر تک واپس نہ جا سکے۔ ہندوستان سے ان کا تعلق تقریباً منقطع ہو گیا۔ یہ پوری مدت انھوں نے کراچی میں انجمن ترقی اردو کے استحکام و ترقی کے کاموں میں اور اردو کی ترویج و اشاعت کے پروگرام بنانے اور وسائل تلاش کرنے میں صرف کی۔ اکتوبر میں وہ پھر دلی واپس ہوئے لیکن اس دوران میں ان کے متعلق غلط فہمیوں کا ایسا جال بچھ چکا تھا جس کے بعد ہندوستان میں رہ کر ان کے لیے کام کرنے کے تمام امکانات ہی ختم ہو گئے چنانچہ مولوی صاحب کے دوستوں اور عقید تمندوں نے ان کو

یہی مشورہ دیا کہ ان کے لیے ہندوستان میں رہ کر کام کرنا ممکن نہیں اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہندوستان کو خیرباد کہہ دیا جائے، خود مولوی صاحب نے جذبات سے ہٹ کر اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچا تو اس کے سوا کوئی راہ نظر نہ آئی کہ پاکستان چلے جائیں۔ چنانچہ مولوی صاحب نے دل پر پتھر رکھ کر ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"دلی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی آخر تنگ آکر اسی میں خیریت دیکھی کہ دلی کو خیرباد کہیں۔ .... آخر ۲۸ رجنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ہوا جہاز میں سوار ہوا۔

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں !"

(پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ص ۲۲۸)

پاکستان تشریف لانے کے بعد بھی مولانا آزاد سے اُن کا تعلق برابر رہا کئی بار ان کی خدمت میں خط لکھا اور مولانا کا جواب آیا۔ قومی زبان وسط ۱۹۴۸ء ہی میں جاری ہو چکا تھا۔ اس میں متعدد بار کسی نہ کسی انداز سے مولانا کا تذکرہ آتا رہا اور اس سے کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ مولوی صاحب مولانا آزاد کے مخالف ہیں۔ مولانا کی رائے کی ان کے نزدیک کوئی قدر نہیں، یا مولانا کی علمی و ادبی خدمات یا ان کی سیاسی عظمت کے منکر ہیں۔ یہ درد رہ تھا کہ مولوی صاحب کو سب سے زیادہ مشتعل ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ ابوالکلام ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ انجمن ترقی اردو کا وزارت تعلیم ہی سے تعلق تھا۔ آیندہ پروگرام کے بارے میں مولانا کی رائے دوسری تھی۔ مولوی صاحب کی دوسری تھی۔ انجمن ترقی اُردو کے معاملات مولوی صاحب کی مرضی کے مطابق طے نہ ہو سکے تھے لیکن ان کے رویے سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ مولانا آزاد کے مخالف ہیں ان کی عظمت کے منکر ہیں یا ان کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ اسی دوران میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کانووکیشن میں مولانا کے خطبے کو ۱۵ ر مارچ ۱۹۴۹ئہ کے قومی زبان میں "امام الہند کا بصیرت افروز خطبہ" کے جلی عنوان سے نمایاں طور شائع کیا اور اس طرح اپنے قارئین کو یہ تاثر دیا کہ مولانا کے خیالات صحیح اور قومی زبان کو ان سے اتفاق ہے۔ اس خطبے میں مولانا نے فرمایا تھا،

"موجودہ اردو کو ترقی دینے میں علی گڑھ یونیورسٹی نے نمایاں حصہ لیا ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے لیکن اس کو اب اپنی کوششوں میں اور وسعت پیدا کرنا

چاہیے اور اسے ہندی ادب میں بھی دلچسپی لینی چاہیے مسلمان مختلف زبانوں کے سیکھنے اور دلچسپی رکھنے میں شہرت رکھتے ہیں...... برج بھاشا کی ترقی اکبر اور جہانگیر کے عہد کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور اس سلسلے میں محمد جائسی، خان خاناں اور عبدالجلیل بلگرامی کے نام کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ میری خواہش ہے کہ یہ ادارہ ایسے لکھنے والے پیدا کرے جو ہندی اور اُردو میں مساوی قابلیت اور اہلیت رکھتے ہوں۔"

ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان کے متعلق تجاویز پیش کرنے کے لیے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس سے جب مولانا نے استعفیٰ دیا اور پارلیمنٹ میں بیان دیا اور بتلایا کہ کمیٹی نے کس طرح غلط جذبات سے کام لیا ہے تو مولوی صاحب نے اس بیان کو قومی زبان (۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں شائع کیا۔ "خیابان ادب" کے زیرِ عنوان علمی و ادبی واقعات و تاثرات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تو اس میں مولانا آزاد سے اپنی ملاقات کا اور آسان اردو کے بارے میں مولانا کے خیالات اور عادتاً مشکل پسندی کا ایک دل چسپ واقعہ خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا۔ یہ واقعہ اس مضمون کے ضائم میں ملاحظہ ہو، اس سے مولوی صاحب کا یہ کردار واضح ہوتا ہے کہ وہ مولانا آزاد کے نہ مخالف تھے نہ دشمن۔ بلکہ اگر ان واقعات کی روشنی میں ایک رائے قائم ہی کی جائے تو وہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں بزرگوں میں روابط تھے، تعلقات تھے اور اگر گہرے اور دوستانہ تعلقات نہ تھے تو بُعد وانکار اور مخالفت بھی نہ تھی۔

تعلقات کے ثبوت میں اس واقعے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جب مولوی صاحب نے اسلامیہ کالج لاہور کی بزم فروغ اردو کے سپاسنامہ کی جوابی تقریر میں فرمایا:

"میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا "تم یہاں کام نہیں کر سکتے پاکستان چلے جاؤ"۔ میں نے کہا جہاں اُردو پیدا ہوئی اور جہاں کی وہ زبان ہے وہاں اس کے لیے کام کیوں نہ کروں یہاں ضرور کام کروں گا اس پر انھوں نے کہا "یہاں کے حالات ٹھیک نہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمھارے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر تمھیں گرفتار کر لیا جائے گا"۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لیے آزادی سے کام کریں گے یہاں آ کر میں نے از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی

اردو کالج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے روشن نہیں"۔ (قومی زبان یکم و ۱۶ مارچ ۵۹ء)

اس بیان سے بعض دوستوں کو شدید غلط فہمی پیدا ہو گئی اور اس کا اظہار اخبارات و رسائل میں کیا گیا تو مولوی صاحب نے ایک بیان میں صاف اور واضح الفاظ میں اس کی تردید کر دی اور غلط فہمی کو دور کر دیا اس بیان سے مولانا آزاد کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب نے اس بیان میں فرمایا:

"میں نے اسلامیہ کالج لاہور کی بزم فروغ اردو کے سپاسنامے کے جواب میں جو تقریر کی تھی اس میں مولانا آزاد کا بھی ذکر آیا تھا اس سے بعض صاحبوں نے غلط مطلب نکال کر میرے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا ہے یہ وہی حضرات ہیں جو اس سے قبل بھی اسی قسم کا پروپیگنڈہ کر چکے ہیں۔ اس لیے مجھے اس فقرے کی وضاحت کرنی پڑی جس سے غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

پاکستان آنے سے قبل مولانا آزاد سے انجمن کے کام کے بارے میں دو تین بار ملاقات ہوئی۔ ہر بار انھوں نے یہی فرمایا کہ حالات بہت خراب ہیں اور طرح طرح کے شبہات ہیں اگر آپ یہاں کام کرنے پر مصر ہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر گرفتار کر لیا جائے گا۔ مولانا کا یہ کہنا بالکل درست تھا اس زمانے میں جب میں دلی میں تھا سی آئی ڈی والے ہمارے در پے تھے میرے ملازموں کو ورغلاتے یا ستاتے تھے۔ بعض اشخاص مجھ سے ملنے آتے اور اردو سے ہمدردی ظاہر کرتے اور میرے کام کی تعریف کرتے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی پولیس والے اکثر ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہ تھا کہ مولانا ایسا کرتے یا مولانا کے اشارے پر پولیس والے اس کے مرتکب ہوتے۔ یہ بات تو مولانا کا سخت مخالف بھی نہیں کہہ سکتا مولانا نے عام حالات کا ذکر کیا تھا جو اس ابتری اور فساد کے زمانے میں پائی جاتی تھی"۔

(قومی زبان یکم و ۱۶ مارچ ۵۹ء)

اس بیان سے جہاں غلط فہمیوں کی تردید ہوتی ہے وہاں کئی باتیں اور معلوم ہوتی ہیں اولاً یہ

کہ مولانا آزاد کے تعلق سے ان کے خلاف اس سے پہلے بھی اسی قسم کی باتیں کہی گئی ہیں، وہ جھوٹ ہیں اور ان کے خلاف محض پروپیگنڈا ہے "ثانیاً" جو بات ان کا مخالف بھی زبان پر نہیں لا سکتا مولوی صاحب سے منسوب کی جائے جو ان کے مخالف اور دشمن نہیں ہیں ثالثاً مولوی صاحب نے یہ کہہ کر کہ "یہ بات تو مولانا کا سخت مخالف بھی نہیں کہہ سکتا" اپنے آپ کو نہ صرف مخالفین کی صف سے علاوہ کر لیا ہے بلکہ مخلصوں اور دوستوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا آزاد سے مولوی صاحب کے تعلقات میں اخلاص و محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری صحافت کی یہ روایت اور مزاج بن چکا ہے کہ اپنے مخالف کو اوّل تو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تعریف و توصیف تو دور کی بات ہے اس کے کاموں کے تذکرہ اور اس کے نام اور تصویر وغیرہ سے بھی اپنے اخبار کے دامن کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں بالفرض اس کے لیے مجبور ہی ہو جائیں تو اس کی سب سے خراب تصویر اور اس کے اہم سیاسی بیان کو کاٹ چھانٹ کر یا ایڈیٹر کے نام خطوط کے کالموں میں جگہ دیں گے اور اتنے باریک قلم سے اور ایسی کتابت کروائیں گے کہ اسے پڑھا نہ جا سکے البتہ اگر اس کے بیان سے اختلاف کی گنجائش نکلتی ہو تو اسے نمایاں طور پر شائع فرمائیں گے اور پھر اس پر زوردار اختلافی اداریہ لکھیں گے اور خوب خوب طنز کریں گے اس بات کو ذہن میں رکھ کر سوچیے کہ اگر مولوی صاحب مولانا کے مخالف یا دشمن ہوتے تو کم از کم اپنے اخبار میں ان کا تذکرہ نظر انداز تو کر ہی سکتے تھے حالانکہ اگر وہ ایسا بھی کرتے تب بھی اس چیز کو ان کی مخالفت، دشمنی یا انکار پر محمول نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ تمام باتیں جو اوپر عرض کیں اس بات کی تائید میں جاتی ہیں کہ دونوں بزرگوں کے، مابین مخلصانہ تعلقات تھے۔ لیکن اس بات کے ثبوت میں اس سے بڑی بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ مولانا آزاد کی وفات پر ان کی یاد میں قومی زبان کا ایک شمارہ مخصوص کرنے کی ہدایت فرمائی اور ہم دیکھتے ہیں کہ قومی زبان کا ایک پورا نمبر ابوالکلام کے تذکرے کے لیے وقف ہے۔ انجمن کی انتظامیہ کا جلسہ بلوایا قرارداد تعزیت پیش کی، جواہر لال نہرو کو تعزیتی تار بھیجا، مولانا کے متعلقین سے اظہار تعزیت کیا۔ اب اگر انھوں نے کسی عقیدت مند کی طرح اپنا گریباں چاک نہیں کر ڈالا بال نہیں نوچ ڈالے اور ہوا کے پروں پر اڑ کر ان کے مرقد پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے نہیں گئے یا روشنائی کی جگہ خون

کے آنسوؤں سے نذرانۂ محبت پیش نہیں کیا اور ان کی یاد میں کسی اخبار کے صفحات پر محفلِ ماتم کا اہتمام نہیں کیا، یا اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے حجرے میں بند ہو کر نہیں بیٹھ رہے یا کسی اور معتقد کی طرح مولوی صاحب نے کھانا پینا نہیں چھوڑ دیا تو ظاہر ہے کہ مولوی صاحب ان کے معتقد تو تھے نہیں انہیں مولانا کے انتقال کا بے حد رنج تھا لیکن کیا کرتے صبر کیا بہر حال ان کے بے چینی اور افسردگی تو چھپی نہیں رہی یہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تعلقات کا ایک پہلو جسے ہم دوستی اور شخصی تعلقات کا نام دے سکتے ہیں اس پہلو میں دونوں شخصیتوں کے اخلاص و محبت کی جلوہ فرمائی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں کے درمیان اختلاف بھی تھے اور ہم ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ آل احمد سرور نے راقم الحروف کے نام ایک خط میں مولانا آزاد سے مولوی صاحب کے اختلافات کے بارے میں تحریر فرمایا تھا:

"واقعہ یہ ہے کہ مرحوم مولانا کے ساتھ مرحوم عبدالحق کبھی انصاف نہیں کر سکے شروع سے وہ مولانا سے بیزار تھے۔ پہلے ان کے ادبی اسلوب پر برہم تھے پھر اردو تحریک کے زمانے میں جن لوگوں کے ساتھ رہے ان کے اثر سے مولانا کے سیاسی مسلک سے انہیں اختلاف ہو گیا۔ مولانا نے اس کے باوجود انجمن کی اور ان کی مدد کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کے دونوں ملکوں میں کام کرنے کو وہ غلط سمجھتے تھے اور میں بھی یہی سمجھتا ہوں بلکہ مولوی صاحب مرحوم سے کہہ بھی چکا تھا۔" (مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

مولانا غلام رسول مہر صاحب نے اسی سلسلے میں میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

"یہ ٹھیک ہے کہ مولوی عبدالحق کے گرد ایسے لوگوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو لیگی ذہن رکھتے تھے اور مولانا آزاد کے مخالف تھے۔ مولوی صاحب ان لوگوں سے متاثر تھے لیکن ان کے اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شبلی کو سخت [1]

---

[1] آخری زمانے میں مولوی صاحب نے علامہ شبلی کے بارے میں رسالہ "ادیب"، علی گڑھ کے شبلی نمبر میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ اس رائے کے برعکس ہیں۔ (قومی زبان)

ناپسند کرتے تھے اور شبلی اسکول کو بھی ناپسندگی کی نظر سے دیکھتے تھے، مولانا آزاد کو اگر کسی اسکول سے وابستہ کیا جاسکتا ہے تو وہ شبلی اسکول ہے۔ اس لیے وہ مولانا آزاد کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ شبلی کے مقابلے میں وہ حالی کے بہت مداح تھے بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ وہ شبلی کے دشمن اور حالی کے عقیدتمند تھے"

مولانا مہر صاحب نے مزید فرمایا تھا:

"واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی مخالفت ان کی ایک کمزوری تھی اور اکثر لوگ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے"

ایک اور عزیز کا بیان ہے کہ "انجمن ترقی اردو ان کی کمزوری تھی اور ان کی اس کمزوری سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا اگر کوئی شخص مولوی صاحب کو کسی کے خلاف کرنا چاہتا تو وہ مولوی صاحب کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا کہ وہ انجمن ترقی اردو کا مخالف ہے اور اسے نقصان پہنچا رہا ہے اور کسی کے بارے میں اس قدر کہہ دینا مولوی صاحب کو اس کے خلاف کر دینے کے لیے کافی تھا" چنانچہ مولانا آزاد کے مخالفین نے مولوی صاحب کو ان کا مخالف بنانے کے لیے ان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔

ان بیانات کی روشنی میں مولوی صاحب کے مولانا آزاد سے اختلاف کے مندرجہ ذیل وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ مولانا آزاد کا ادبی اسلوب۔

۲۔ مولانا آزاد کا سیاسی مسلک۔

۳۔ تقسیم ملک کے بعد دونوں ملکوں میں کام کرنے کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے سے اختلاف۔

۴۔ مولوی صاحب کا شبلی سے اختلاف اور مولانا آزاد کی شبلی اسکول سے وابستگی۔

جہاں تک پہلے سبب کا تعلق ہے یہ ایک خالص نظریاتی معاملہ ہے۔ اس کا ذاتیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر مولانا آزاد عربی فارسی آمیز مشکل اردو لکھتے تھے اور یہ بات مولوی صاحب کو ناپسند تھی تو اسے کسی ذاتی اختلاف کی وجہ قرار دینا درست نہیں۔ آخر مولانا ظفر علی خاں بھی تو ایسی اردو لکھتے تھے۔ اُن سے مولوی صاحب کو اختلاف کیوں نہ ہوا۔ دوسرے سبب کی نسبت صرف اس قدر عرض کروں گا کہ مولوی صاحب سیاسی آدمی ہی نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی سیاست

سے رشتہ نہیں جوڑا۔ اس معاملے میں ان کی رائے کبھی ان کی اپنی رائے نہیں رہی، انھوں نے خود کبھی اپنی سیاسی حیثیت کا دعویٰ نہیں کیا دوسرے لوگوں نے اس وجہ سے انھیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی اس لیے اس موضوع پر بحث کرنا محض لاحاصل ہے۔

ان دونوں اسباب اختلاف پر بالکل دوسرے انداز میں غور کیجیے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ مولوی صاحب مولانا آزاد کے اسلوب تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تو ٹھیک ہے، مولوی صاحب کو اس اختلاف کا حق ہے، مولوی صاحب کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں جو مولانا کے اسلوب تحریر کو اردو کے حق میں مفید نہیں خیال کرتے تھے اور مولانا کے ساتھ کچھ لوگ ہیں جو مولانا کے اسلوب تحریر کو تمام اسالیب بیان پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور سر دھنتے ہیں پس یہ اختلاف مولوی صاحب کا مولانا سے نہیں بلکہ ایک ادبی اسلوب کو پسند یا ناپسند کرنے والوں کا ہوا۔ اس سلسلہ بحث میں عبدالحق کو ابوالکلام کے مخالف کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جاسکتا البتہ اگر دونوں مرحومین کو ہم دو اسالیب تحریر کا نمائندہ مان لیں تو موازنہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ رہ گیا سیاسی مسلک کی بنا پر اختلاف تو سیاسی معاملے میں مولوی صاحب کی رائے اُن کی اپنی ہو یا وہ کسی سے متاثر ہوں۔ مولوی صاحب سیاسی آدمی ہوں یا نہ ہوں۔ مولانا سے اختلاف کا انھیں بہ ہر حال و بہ ہر صورت حق حاصل تھا۔ محض اس وجہ سے کہ وہ سیاسی آدمی نہ تھے اور عام پیشہ ور سیاستدانوں کی طرح انھوں نے سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا ان سے حقِ اختلاف چھینا نہیں جاسکتا۔ پھر اگر مولانا سے اختلاف کا یہ سبب تھا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ اختلاف ذاتی نہیں تھا۔ یہ بھی دو مکاتبِ فکر کا اختلاف تھا اور نشان دہی کی جاسکتی ہے کہ مولانا کے سیاسی طور پر ہم خیال ہندو اور مسلمان مولوی صاحب کے دوستوں اور رفیقوں میں شامل تھے۔ پس اگر ان دوستوں اور رفیقوں سے سیاسی اختلاف مولوی صاحب کی دوستی اور رفاقت میں مانع نہیں ہوا تو یہ بات مولانا آزاد سے مولوی صاحب کی مخالفت کا سبب کیونکر ہوسکتی ہے۔

چوتھا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ چونکہ مولوی صاحب شبلی کے مخالف تھے اس لیے شبلی کے وابستگان کے بھی مخالف تھے۔ بلاشبہ مولوی صاحب شبلی کو پسند نہیں کرتے تھے شبلی سے انھیں دشمنی کی حد تک اختلاف تھا لیکن ابوالکلام کو ناپسند کرنے یا ان سے اختلاف کا یہ سبب ہر گز نہ تھا۔ شبلی کے تعلق سے وہ صرف سید سلیمان ندوی مرحوم کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جو اسباب شبلی سے مولوی صاحب کے اختلاف

اور دشمنی کے تھے سید صاحب سے اختلاف کے اسباب ان کے علاوہ بھی تھے۔ ایک سبب اختلاف کا یہ ہو سکتا ہے کہ شبلی سر سید اور ان کے مکتبہ فکر کے بڑے مخالف اور نکتہ چین تھے اور ابوالکلام اسی اسکول سے تعلق رکھتے تھے تو یہ بھی صحیح نہیں عام طور پہ ابھی اس مسئلے پر غور نہیں کیا گیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ سر سید اور ان کے مکتبہ فکر سے اختلاف میں مولانا آزاد شبلی سے متاثر تھے۔ ممکن ہے شبلی کی وجہ سے مولانا آزاد کے خیالات میں پختگی اور اختلاف میں شدت پیدا ہو گئی ہو لیکن یہ فکر مولانا کی اپنی تھی اور ان کے اپنے مطالعے اور اندازِ فکر نے انھیں اس نتیجے پر پہنچایا تھا اگر آزاد شبلی سے کسی درجے میں بھی متاثر تھے تو شبلی بھی مولانا آزاد سے متاثر ہوئے تھے۔ اس مسئلے میں بھی اور دیگر مسائل اور افکار و نظریات میں بھی۔ بہ ہر حال اگر شبلی سے مولوی صاحب کے اختلاف کا سبب مسلک سر سید سے شبلی کا انحراف تھا تب بھی مولانا آزاد کی مخالفت کا سبب ہمارے نزدیک آزاد شبلی تعلق نہیں تھا۔ کتنے ہی لوگ اردو کی تحریک میں مولوی صاحب کے شریک تھے حالاں کہ انھیں سر سید کے افکار و خیالات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا اور علی گڑھ کے سیاسی مکتبہ فکر اور طرز سیاست سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پس جو اختلافِ فکر و نظر مولوی صاحب سے دوستی اور رفاقت میں حائل نہ ہوا وہ مولانا آزاد کی مخالفت اور ان سے اختلاف کا سبب کیونکر بن سکتا ہے۔ ہم یہاں امکان کی نفی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے وقوع کے بارے میں ہمیں شبہ ہے۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے اسباب اختلاف میں سے نمبر ۱، ۲ اور ۴ کے بارے میں جو کچھ عرض کیا یہ راقم السطور کی رائے ہے اور ہر گز ان کی صحت پر اصرار نہیں اس مسئلے میں مولانا غلام رسول مہر اور آل احمد سرور ہی رائے دینے کے اہل ہو سکتے ہیں انھی حضرات کی رائے وقیع اور صائب ہو سکتی ہے۔ بہ ہر حال اگر کوئی صاحب یہی خیال کرتے ہیں کہ مولانا آزاد سے عبدالحقؒ کی مخالفت کے یہی اسباب ہیں تو غور کیجیے کہ مولوی صاحب کے دوستوں اور رفیقوں میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اپنے سیاسی مسلک کے لحاظ سے اپنی علمی و عملی زندگی میں مولوی صاحب اور سر سید کے مکتبہ فکر سے دور اور مولانا آزاد کے ہمنوا ہیں لیکن با ایں اختلاف فکر و عمل مولوی صاحب سے دوستی اور رفاقت کا رشتہ استوار رہا۔ مولوی صاحب کا ان سے اخلاص و محبت کا برتاؤ رہا لیکن مولانا آزاد کے معاملے میں یہ علمی و فکری اور سیاسی اختلاف مخالفت اور انکار کا سبب بن گیا اور اس بنا پر مولوی صاحب کبھی مولانا سے انصاف نہیں کر سکے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس

سے اتفاق نہیں کر سکے ۔

اب ہم تیسرے سببِ اختلاف کی نسبت چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں ۔ آل احمد سرور صاحب کی رائے یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم چونکہ بیک وقت دونوں ملکوں میں اردو تحریک کی رہنمائی کرنا چاہتے تھے ، مولانا آزاد کو اس رائے کی صحت سے اختلاف تھا اس لیے مولوی صاحب مولانا آزاد کے مخالف ہو گئے ۔ مولوی صاحب کیا چاہتے تھے ۔ اور ان کی کیا رائے تھی مناسب ہو گا کہ پہلے مولوی صاحب کی زبان سے اس اختلاف رائے کی کہانی سن لی جائے تاکہ واقعے کی پوری تفصیل علم میں آجائے اس کے بعد کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا آسان ہو جائے گا ۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں :

" دلی پہنچنے کے دو دن بعد یعنی ۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا ابو الکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور حقیقت حال بیان کی کہ انجمن کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا ۔ انجمن کے نام سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں ۔ انھوں نے فرمایا کہ بہت بدگمانیاں ہیں ۔ آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیں یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں ۔ میں نے کہا میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان ، ایران ، چین ، عرب ، انڈونیشیا وغیرہ میں ۔ رہی بدگمانیاں تو ان کے رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے اس کے لیے پوری آزادی ہو ۔ خصوصاً اردو کے لیے جو یہاں کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے ۔ کہا یہ ٹھیک ہے لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں ۔ میں نے کہا کہ آپ تعزیرات ہند میں ایک دفعہ کا اضافہ کیوں نہیں کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہی ختم ہو جائے ۔" (تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو ص ۲۰۴)

مولوی صاحب مرحوم نے اس بیان میں نہ صرف اپنے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی ہے بلکہ مولانا مرحوم کے خیالات کی بھی صحیح تصویر پیش کی ہے ۔ مولانا آزاد کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ مولوی صاحب کے مذکورہ بالا بیان سے مولانا کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور غلط فہمیوں کی موجودگی میں ہندوستان میں کام کرنا ممکن نہیں اس لیے پاکستان میں لاہور یا کراچی کو مرکز بنایا جائے اور وہاں کام کیا جائے ۔

لیکن کیا یہ مشورہ وجہ ناراضگی اور سبب اختلاف بن سکتا ہے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ مشورہ صرف مولانا نے دیا تھا یا کسی اور نے بھی دیا ؟ اور اگر کسی دوسرے شخص کی بھی یہی رائے تھی اور یہ مشورہ دیا تھا تو کیا مولوی صاحب مرحوم اس کے بھی مخالف ہو گئے تھے اور ان سب سے ان کی لڑائی ہو گئی تھی ؟ خود مولوی صاحب کا بیان ہے کہ

"میرے سب دوست احباب سمجھاتے تھے کہ اب اس ملک میں اردو کے کام کے لیے کوئی گنجایش نہیں حکومت مخالف، اکثریت مخالف، کوئی کیا کام کر سکتا ہے، خصوصاً تمھارا وہاں (ہندوستان) جاکر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں اور تو اور ہمارے علامہ مخدوم کیفی صاحب بھی دلی میں رہ کر کام کرنے کے مخالف تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ہندوستان میں تو اردو کا خاتمہ ہو گیا اب یہ پنپے گی تو پاکستان ہی میں پنپے گی۔" (پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۱۹۲)

۲۵ر جنوری ۱۹۴۸ء کو علی گڑھ میں مولوی صاحب نے ہمدردان اردو کی ایک میٹنگ بلائی اور انجمن کے مرکز اور پروگرام کے بارے میں مشورہ چاہا تھا تو بعض صاحبوں نے مشورہ دیا کہ تبلیغ واشاعت کا کام بالکل بند کر دیا جائے، انجمن کا نام بدل دیا جائے لیکن مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس مشورے کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ پھر فرماتے ہیں کہ "اس اجتماع میں جو صاحب شریک تھے ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ سے کچھ سہمے ہوئے سے ہیں اور کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے یا صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے۔"

(پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۱۹۲ء)

اس معاملے میں اگر کسی نے پوری صفائی سے کام لیا اور بے کم و کاست اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ صرف ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خط مولوی صاحب نے نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا تھا:

"معاملہ زیر غور سے متعلق جو میری رائے ہے وہ لکھتا ہوں: میری رائے ہے کہ اردو کی ترقی و ترویج کا کام ہندوستان میں اب پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے اس لیے اس کام کا کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی میری یہ رائے

بھی ہے کہ انجمن ترقی اردو کے کام کی جو نوعیت گذشتہ چند سالوں میں رہی ہے اس کے پیش نظر موجودہ کارکنوں کا یہاں کام کرنا بہت دشوار ہوگا۔ انھیں پاکستان میں اردو کی خدمت میں زیادہ سہولت ہوگی اور وہاں وہ مفید کام انجام دے سکیں گے، اس لیے انھیں وہاں کام کرنا چاہیے اور یہاں خدمت اردو کے لیے کوئی دوسرا انتظام ہونا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لیے دوسرے کارکن مقرر کرکے اسے یہاں قائم رکھا جائے۔ اور موجودہ کارکن پاکستان میں دوسری انجمن قائم کرلیں۔ میری رائے ہے کہ پاکستان اور ہند کے سیاسی تعلقات کی موجودہ حالت میں یہ غیر مناسب ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان کے اس کام میں کوئی انتظامی یا شخصی تعلق رہے۔" (پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۲۱۰)

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے زبانی طور پر بھی مولوی صاحب سے یہ فرمایا تھا کہ "ظاہر ہے آپ اپنا اصول نہیں بدلیں گے اس لیے یہاں رہ کر کام کرنا آپ کے حق میں مناسب نہ ہوگا۔"

جناب آل احمد سرور تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا آزاد نے اگر مولوی صاحب کو پاکستان جانے کا مشورہ دیا تو اس بنا پر کہ وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں کام کرنا چاہیے تھے اور یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کیوں کہ ان حالات میں دونوں جگہ غلط فہمی اور کام میں نقصان کا قوی احتمال تھا۔"

(چٹان۔ لاہور۔ ۱۸ر جنوری ۵۹ء)

راقم کے نام ایک خط میں بھی تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی صاحب مرحوم کے دونوں ملکوں میں کام کرنے کو وہ (مولانا آزاد) غلط کہتے تھے اور میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ بلکہ مولوی صاحب مرحوم سے کہہ بھی چکا تھا۔"

علی گڑھ کی مشاورت میں جن حضرات نے اردو کی تبلیغ و اشاعت کا کام بند کر دینے کا مشورہ دیا تھا، یا علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی جنھوں نے مولوی صاحب کو پاکستان میں کام کرنے کا مشورہ دیا تھا، یہ تمام حضرات مولوی صاحب کے دوست معتقد اور نیاز مند تھے۔ دلی جانے اور وہاں کام کرنے سے روکنے والوں کو خود مولوی صاحب نے اپنا دوست اور احباب لکھا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے مولوی صاحب مرحوم کے تعلقات دوستانہ

تھے۔ مجلس نظما میں مولوی صاحب کے سب دوست تھے جنھوں نے فیصلہ کیا مولوی صاحب اپنی کتابیں انجمن کے کتب خانے سے نکال لیں اور اگرچہ مجلس نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ مولوی صاحب پاکستان چلے جائیں لیکن حالات ایسے پیدا کر دیے کہ مولوی صاحب کے لیے ہندوستان چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا مولوی صاحب کو بیگم اعزاز رسول اور پروفیسر محمد شریف کا یہ مشورہ ناگوار گزرا تھا کہ انجمن ترقی اردو کا نام بدل دیا جائے مولوی صاحب نے اپنی اس ناگواری کا اظہار کیا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مولوی صاحب نے دوستی اور اخلاص و محبت کا رشتہ کسی سے نہیں توڑا، کسی سے لڑائی نہیں کی اور اس وجہ سے کسی سے نہ تعلقات ختم کیے نہ کسی کی مخالفت کی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے تو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ موجودہ کارکنوں کو پاکستان جاکر اردو کی خدمت انجام دینی چاہیے اور یہاں کوئی دوسرا انتظام کیا جائے پھر اپنی اس رائے کی وجہ وہ ۴۸ - ۱۹۴۷ء کے سیاسی حالات یا مولوی صاحب کے سفر پاکستان سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کو نہیں بتاتے بلکہ انجمن کے پچھلے کردار اور گذشتہ برسوں میں انجمن کے کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے وہ یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ موجودہ کارکن پاکستان چلے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ کا مطلب اتنا ہی نہیں جتنا کہ سمجھا گیا۔ اس میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ آج انجمن کے کارکنوں کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں، ان کو جن مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑرہا ہے اور انجمن کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ کچھ آج کے حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ پچھلے چند برسوں میں انجمن کے کاموں کی نوعیت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اب اگر ان مشوروں کے بعد مولوی صاحب نے اپنے ان دوستوں اور عقیدت مندوں سے تعلقات منقطع نہیں کر لیے اور ان کی مخالفت پر کمر بستہ نہیں ہو گئے تو وہ مولانا آزاد کے اس مشورے کی بنا پر کہ ان کے لیے یہاں حالات سازگار نہیں ہیں غلط فہمیاں بہت ہیں، ان کو پاکستان میں کراچی یا لاہور کو اپنا مرکز بنانا چاہیے، مولانا کے مخالف کیوں ہو سکتے ہیں؟ اور ہماری رائے یہی ہے کہ انھوں نے اس وجہ سے کبھی مولانا کی مخالفت نہیں کی۔ خود مولوی صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ واقعتاً حالات ابتر تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اختلاف تھے تو کیا تھے، کیوں تھے اور ان کی حقیقت کیا تھی؟ ہمارے نزدیک انجمن ترقی اردو کے معاملے میں دونوں کے مابین جو پہلی غلط فہمی پیدا ہوئی اس کی تفصیل بقول مولوی صاحب یہ ہے:

"ایک ہفتے کے بعد میں ۱۲ر اکتوبر کو پھر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا اور کہا کہ میں نے

آپ کی تجویز پر غور کیا اور بعض دوستوں سے بھی مشورہ کیا۔ یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کو ہم کراچی لے جائیں اس صورت میں ہمیں کتب خانہ لے جانے کی سہولت ملنی چاہیے اور جو رقم انجمن نے حکومت ہند کو زمین کی قیمت میں ادا کی تھی وہ واپس ملنی چاہیے۔ مولانا نے فرمایا آپ مجھے لکھیں یہ دونوں باتیں آسانی سے ہو جائیں گی۔"

(پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۲۰۵)

لیکن مولوی صاحب نے نظما کے اجلاس میں فیصلے کے بغیر یہ لکھنا مناسب خیال نہ کیا پھر مولوی صاحب نے نظما کے اجلاس کا دعوت نامہ مولانا کو دیا تو اس میں اپنا ایک نجی خط بھی رکھ دیا جس میں یہ بھی لکھا کہ "آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ دیا تھا اس سے مجھے اتفاق ہے اور یہ معاملہ مجلس نظما میں پیش کر کے قطعی فیصلہ کر لیا جائے گا۔" (ایضاً ص ۲۰۶)

لیکن مولانا اس خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ دیا تھا اس سے مجھے اتفاق ہے "مشورہ" سے مقصود غالباً یہ معاملہ ہے کہ اب انجمن ترقی اردو کو پاکستان منتقل کر دیا جائے، اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے صورت حال کی جو تعبیر کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، براہ عنایت اپنے فیصلے کو میرے مشورے کا جامہ نہ پہنائیے۔" (ایضاً ص ۲۰۸)

مولانا فرماتے ہیں "کہ جب آپ مجھ سے ملے تو میں نے یہ رائے ظاہر کی کہ تعطل و تعلیق کی موجودہ صورت حال جلد ختم کر دینی چاہیے آپ نے ایک قدم پاکستان میں جمایا ہے دوسرا یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طرز عمل انجمن کے لیے سودمند نہ ہو گا...... جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ انجمن ہندوستان میں قائم ہوئی تھی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں اپنا کام یہاں جاری نہ رکھے؟ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی خواہش مند نہیں ہے کہ انجمن اپنے کاموں کو یہاں بند کر دے آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال ایجوکیشن منسٹری نے انجمن کے لیے ایک گرانٹ منظور کی ہے اور اسے کام میں نہ لانے کی پوری ذمہ داری ارکان انجمن کے

سرہے۔ چار لاکھ عمارت کے لیے اور چالیس ہزار سالانہ انجمن کے کاموں کے لیے گورنمنٹ منظور کر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گورنمنٹ انجمن کو گرانٹ دے رہی ہے وہ انجمن کے اجرائے کار کی مخالف کیسے ہو سکتی ہے؟" (ایضاً ص ۲۹)

۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو انجمن کی مجلس نظما کا علی گڑھ میں اجلاس ہوا اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا خط پڑھ کر سنایا گیا مولانا آزاد کی رائے اور انجمن کے بارے میں حکومت کی پالیسی کی وضاحت کی گئی۔ چنانچہ مجلس نظما نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی رائے سے اتفاق کیا اور فیصلہ کر دیا کہ انجمن بدستور ہندوستان میں کام کرے گی، اس کا کوئی انتظام ہونا چاہیے قدیم کارکنوں کے لیے یہاں مشکلات ہیں، پاکستان میں ان کے لیے کام کرنے کی آسانی ہوگی اس لیے ان کو پاکستان میں کام کرنا چاہیے اور مولوی صاحب کو اور کیفی صاحب کو اجازت ہے کہ وہ اپنی کتابیں انجمن کے کتب خانے سے علاحدہ کرلیں۔" اس فیصلے سے مولوی صاحب کو جس درجے تکلیف ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ مولوی صاحب یہ خیال کرتے تھے کہ انجمن اور کتب خانے کو پاکستان منتقل کرنے کا فیصلہ کرالیا جائے گا لیکن اس رائے سے کوئی متفق نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کو اس سے حد درجہ مایوسی ہوئی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ مولانا آزاد سے رنجش اس لیے پیدا ہوئی کہ مولوی صاحب پاکستان میں کام کرنے اور "انجمن کو کراچی لے جانے" کی تجویز کو مولانا آزاد کی تجویز بتاتے ہیں اور کہتے ہیں اس پر میں نے غور کیا اور دوستوں سے مشورہ کیا "ہمیں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کو کراچی لے جائیں لہٰذا کتب خانہ لے جانے کی سہولت اور انجمن کے لیے زمین کی ادا شدہ قیمت واپس کی جائے۔" مولانا آزاد اس کو مولوی صاحب کا فیصلہ بتلاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مولوی صاحب کو غلط فہمی پیدا ہوئی۔ مولانا آزاد کبھی انجمن کو پاکستان لے جانے اور کتب خانے کو منتقل کرنے کا مشورہ نہ دے سکتے تھے۔

مولانا آزاد سے رنجش اور خفگی کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ مولانا آزاد نے اپنے خط مورخہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یہ لکھا کہ "آپ کے پرمٹ سے معلوم ہوا کہ آپ نے انڈین یونین کی سکونت ترک کر دی ہے اور پاکستان کے باشندہ ہونے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔"

(پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۳۰۸)

مولوی صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میرے پرمٹ میں مجھے ہندوستانی لکھا ہے پاکستانی نہیں لکھا۔ میں نے کراچی

میں انجمن کے لیے ایک مکان حاصل کیا ہے۔۔۔۔۔ اور پاکستان کے لیے بالکل الگ مرکز قائم کیا ہے۔" (ایضاً ص ۲۱۱)

اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ ابوالکلام آزاد کو اطلاع قطعاً غلط پہنچائی گئی کہ پرمٹ مولوی صاحب کے پاکستان ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ مولوی صاحب پاکستانی بن چکے تھے اگرچہ پرمٹ انھیں ہندوستانی ہائی کمیشن نے دیا تھا۔ اس دور میں اس قسم کی غلطیاں بعید از قیاس نہیں شاید ایسی کئی مثالیں لوگوں کے علم میں ہوں کہ ۴۸-۱۹۴۷ء میں کئی لوگ بیک وقت پاکستان کے شہری بھی تھے اور ان کے ہندوستانی شہریت کے حقوق بھی سلب نہیں ہوتے تھے لیکن جیسے جیسے حالات تبدیل ہوئے اور حکومت کے نظم و ضبط پر قابو پایا گیا اس قسم کی دورنگیاں ختم ہوتی گئیں۔

مولوی صاحب اواخر نومبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان تشریف لائے تھے۔ اس کے بعد یہاں کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا یہ انجمن ترقی اردو ہند سے بالکل علاحدہ اور مستقل ادارہ تھا اور دونوں میں کوئی دستوری یا تنظیمی تعلق نہ تھا۔ ایک پاکستانی ادارہ تھا دوسرا ہندوستانی۔ لیکن سکریٹری دونوں اداروں کے مولوی صاحب تھے۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد یہ کوششیں کی گئیں کہ انجمن کے لیے ایک مکان الاٹ کرایا جائے چنانچہ اس سلسلے میں مولوی صاحب نے اپنے دوستوں سے مل کر درخواست دی اور مکان حاصل کیا پاکستان میں انجمن کی تمام شاخوں کو آل پاکستان انجمن کے زیر اہتمام منظم کیا اور حکومت سے امداد حاصل کرنے کے سلسلے میں بھی مشورہ کیا۔ ۱۳؍ جنوری ۱۹۴۸ء کو مولوی صاحب نے پھر دلی کے لیے رخت سفر باندھا اس دوران میں ان کا قیام زاہد حسین صاحب کے ساتھ تھا لیکن مارچ میں زاہد صاحب کا دلی سے تبادلہ ہوگیا۔ مولوی صاحب کے قیام کی کوئی صورت نہ رہی چنانچہ مولوی صاحب کو ۵؍ مارچ ۱۹۴۸ء کو دلی سے روانہ ہونا پڑا۔ ان کا آنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ۱۰؍ اپریل ۱۹۴۸ء کے بعد قائد اعظم رح نے انجمن کے افتتاح کا وعدہ فرمایا تھا اس موقع پر مولوی صاحب کی موجودگی جو انجمن کے سکریٹری تھے لازمی تھی۔ اب پورے زور شور کے ساتھ پاکستان میں کام شروع کیا گیا، وسط ۱۹۴۸ء میں مولوی صاحب نے "قومی زبان" جاری کیا، پاکستان میں متعدد اجتماعات کو خطاب کیا، کانفرنسوں میں شرکت کی۔ ان تمام مشغولیتوں اور کارگزاریوں کی روئیدادیں اور اطلاعات اخبارات

اور قومی زبان کے ذریعے مشتہر ہوتی رہیں، اخبارات اور "قومی زبان" میں انھیں کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا سکریٹری لکھا جاتا رہا۔ مارچ سے اکتوبر ۴۸ء تک مولوی صاحب مستقل طور پر پاکستان میں رہے اور اردو کے کاموں میں مصروف رہے۔ یہ تمام اطلاعات ہندوستان بھی پہنچتی رہیں، چنانچہ مولوی صاحب کے ہندوستانی دوست ان سے مایوس ہو گئے، اور سمجھ لیا کہ اب جب کہ مولوی صاحب نے پاکستان میں ایک انجمن بنائی، اس کے سکریٹری مقرر ہو گئے، انجمن کا رسالہ جاری کیا اور وہاں کام کر رہے ہیں تو اب وہ ہندوستان نہیں آئیں گے۔ لیکن مولوی صاحب کی کتابیں اور بہت سا سامان دلی میں تھا اس کو لانا تھا۔ نیز یہ کوشش بھی کرنی تھی کہ انجمن ترقی اردو انجمن کا کتب خانہ کراچی منتقل کیا جائے اس خیال سے اکتوبر کی ۲ یا ۳ تاریخ کو پھر دلی تشریف لے گئے۔ چنانچہ ۱۲/ اکتوبر کو مولانا آزاد سے دوسری ہی ملاقات میں انھوں نے کہا کہ انجمن کو پاکستان منتقل کرنے کی اجازت دی جائے، کتب خانے کو منتقل کرنے کی سہولت دی جائے اور انجمن کی زمین کے لیے دی ہوئی قیمت واپس کی جائے۔ اس درمیان میں (یعنی مارچ تا اکتوبر ۴۸ء کی درمیانی مدت میں) ان کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیل چکی تھیں اور حالات پر جن لوگوں کی نظر تھی وہ جان چکے تھے کہ مولوی صاحب کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے، قومی زبان کراچی کا ڈیکلیریشن حاصل کرنے کے بعد قانونی طور پر بھی پاکستانی ہو گئے اور اب ہندوستان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے جہاں تک پرمٹ کے اندراج سے ان کے پاکستانی ہونے کی تصدیق کا سوال تھا۔ مولانا آزاد کو اطلاع غلط پہنچائی گئی تھی اور مولوی صاحب نے درست فرمایا لیکن یہ صحیح تھا کہ واقعتاً اور قانوناً (اگر کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بننے اور قومی زبان کے ایڈیٹر کے لیے پاکستانی ہونے کی شرط تھی تو) وہ پاکستانی تھے ہندوستان کا یہ سفر صرف اس لیے کیا تھا کہ انجمن کا کتب خانہ پاکستان لانے کی راہ نکالی جائے اور وہ اپنی کتابیں بھی لے آئیں مولوی صاحب نے اپنے خط میں اپنے پاکستانی ہونے کی تردید بھی نہیں کی، صرف یہ کہتے ہیں کہ "میرے پرمٹ میں مجھے ہندوستانی لکھا ہے اور پاکستان کے لیے بالکل الگ مرکز قائم ہے" (خط مورخہ ۲۰/ اکتوبر ۴۸ء) لیکن اس سے انکار نہیں کیا کہ وہ اس مرکزی ادارہ کے سکریٹری اور اس کے ترجمان قومی زبان کے ایڈیٹر ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے اپنے خط میں جو لکھا تھا کہ "یہ غیر مناسب ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان کے اس کام میں کوئی انتظامی یا شخصی تعلق رہے"، اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ مولوی صاحب کل پاکستان انجمن ترقی اردو

کے بھی سکریٹری بن گئے اور ہندوستان میں بھی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ خود مولوی صاحب کے بقول پاکستان میں بالکل الگ اور مستقل مرکز ہے اور ہندوستان کی انجمن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، تو اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ مولوی صاحب دونوں ملکوں کی دونوں انجمنوں کے سکریٹری رہیں۔

لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے مولوی صاحب کو مشتعل کیا اور بقول مولوی صاحب کے جس چیز سے سخت تکلیف اور رنج ہوا حتیٰ کہ اسے ابوالکلام آزاد کی ایمانی لچک قرار دیا وہ مولانا کا یہ کہنا تھا کہ انجمن کے لیے گرانٹ کی رقم انٹرم گورنمنٹ کے زمانے میں کی گئی تھی، لیاقت علی خاں نے گرانٹ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب نئی قومی (یعنی ہندوستانی) حکومت نے گرانٹ منظور کی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ صحیح نہیں کہ لیاقت علی خاں نے گرانٹ دینے سے انکار کر دیا تھا مجھے اس کا ذاتی علم ہے اور یہ منظوری انھوں نے خاص طور پر دی اور میں نے بذات خود اس تحریر کو دیکھا ہے" ہمارا خیال ہے کہ مولانا آزاد کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ لیاقت علی نے گرانٹ دینے سے انکار کر دیا تھا، مولانا آزاد کا خود حکومت سے یا اس شعبے سے اس وقت کوئی تعلق نہیں تھا ان کو کسی نے بتلایا ہوگا اور بلاشبہ غلط بات بتلائی۔ اس قسم کے لوگوں کی بڑی شخصیتوں کے ارد گرد کمی نہیں ہوئی جو دوسروں کے خلاف غلط اطلاعات بھی دیتے رہتے ہیں اور انھیں بھڑکاتے بھی رہتے ہیں اور پھر سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء کے پر آشوب دور میں تو اس قسم کی باتوں پر شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد کے جو واقعات پیش آتے ہیں مولوی صاحب اور مولانا آزاد کے تعلقات کا تیسرا دور تھا اس دور میں مولوی صاحب کے لیے مولانا آزاد کی جو باتیں وجہ رنجش بنیں ان کو ہم نے بیان کر دیا مولوی صاحب کے بیانات اور مولانا آزاد کی تحریر میں حقیقت کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مولوی صاحب کو مولانا آزاد کی گفتگو سے غلط فہمی ہوئی۔ مولانا آزاد کی رائے کے بارے میں انھوں نے جو قیاس کر لیا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ مولوی صاحب کے متعلق مولانا کو غلط اطلاعات پہنچائی گئیں اور ان کو بدگمان کیا گیا۔ بدگمانیوں، غلط فہمیوں اور ایک دوسرے کے خلاف شکوک وشبہات کا یہ دور بہت مختصر تھا۔ مولوی صاحب پاکستان آگئے اور اس روئیداد انجمن کے سوا جو مولوی صاحب نے ان غلط فہمیوں اور شکر رنجیوں کے دور میں مرتب فرمائی تھی۔

ان کی زبان وقلم سے کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے ان کی رنجش اور خفگی کا پتا چلتا ہو۔ بلکہ
ورت حال اس کے برعکس رہی جیسا کہ پچھلے صفحات میں ہم بیان کر آئے ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر بعض دیگر حضرات کے بیانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ انھوں نے
ولوی صاحب اور مولانا آزاد کے تعلق کے بارے میں جو کچھ کہا وہ کہاں تک حقائق وصداقت
بنی ہے۔ نقوش کے شخصیات نمبر ا میں ایک صاحب نے یہ واقعہ تحریر فرمایا تھا کہ:

"انجمن ترقی اردو کے معاملات طے کرنے کے لیے حکومت ہند اور بابائے اردو کے
کے درمیان کئی دن تک طویل گفتگو ہوتی رہی۔ حکومت کی طرف سے وزیر تعلیم مولانا
ابوالکلام اس کام کے لیے مقرر تھے۔ مولانا دوران گفتگو میں بار بار یہی کہتے کہ حکومت
یہ نہیں چاہتی کہ آپ ہندوستان میں رہیں۔ مولوی صاحب سے نہ رہا گیا جل کر
کہنے لگے ۔آپ بار بار حکومت کا ذکر کرتے ہیں کہ حکومت یہ نہیں چاہتی حکومت
وہ نہیں چاہتی۔ حکومت اب کہاں ہے۔ وہ تو پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم
ہوگئی۔ آپ اپنے آپ کو حکومت سمجھتے ہیں۔ بابائے اردو نے بیان کیا۔ مولانا
آزاد کو یہ بات بُری تو بہت معلوم ہوئی ہوگی کیونکہ جب میں نے یہ بات کہی تو ان کے
چہرے کا رنگ بدل گیا تھا" (نقوش شخصیات نمبر ا)

ی طرح رسالہ اُردو کے بابائے اردو نمبر (۱۹۶۲ء) میں بیان کیا گیا ہے:

"اپنی بیش بہا لائبریری کے لٹ جانے کے بعد وہ پاکستان بہت ہی تنگ دل ہو کر
آئے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے جو کہ مولوی صاحب کو ہندوستان سے نکالنے پر
تعینات تھے بڑی سخت سُست بات چیت ہوئی" (صفحہ ۳۴۲)

ضمون میں یہ بھی کہا گیا ہے:

"ادبی میدان میں ان کا (مولوی عبدالحق) مقابلہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسی ہستی تک
سے ہوا" (صفحہ ۳۴۲)

مولوی صاحب مرحوم نے مولانا آزاد سے اپنی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی تفصیلات۔ خود اپنے
سے تحریر فرمائی ہیں ان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کسی ملاقات میں
س قسم کی بات چیت نہیں ہوئی ہر ملاقات دوستانہ ماحول میں ہوئی گفتگو ہمیشہ سنجیدہ رہی کبھی
خت سست سوال وجواب کی نوبت نہیں آئی۔ نہ حکومت کی طرف سے مولانا آزاد کو اس

مسئلے پر ان سے بات چیت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، نہ ابوالکلام ان کو ہندوستان سے نکالنے پر تعینات تھے اگر کوئی ایسی بات ہوتی بھی تو یقین رکھنا چاہیے کہ نہ تو مولوی صاحب تھڑدلے تھے نہ تنگ مزاج کہ یہ اندازِ گفتگو اختیار کرتے۔ جو حالات پیش آئے اور جن مجبوریوں کی بنا پر مولوی صاحب کو ہندوستان چھوڑنا پڑا وہ مولوی صاحب نے اپنے قلم سے لکھ دیے ہیں اگر اس کے علاوہ کوئی وجہ ہوتی تو مولوی صاحب ضرور اسے تحریر میں لے آتے اس روایت کی افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ مولانا ابوالکلام سے ان کا ادبی میدان میں مقابلہ ہوا۔ جیسا کہ سابقہ سطروں میں عرض کیا جا چکا ہے بات صرف اتنی تھی کہ مولوی صاحب مولانا آزاد کی مشکل پسندی اور ان کے اسلوب تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کسی مجلس میں ازراہِ تفنن انھوں نے اس کا اظہار کیا یا کبھی ایک آدھ سطر میں ان کے اسلوب تحریر پر تنقید کر دی۔ اس سے زیادہ کبھی کوئی بات نہ ہوئی مقابلے کے لیے ضروری ہے کہ ابوالکلام نے بھی کبھی ان کے اسلوب تحریر، یا ان کی رائے و تحقیق کے خلاف قلم اٹھایا ہو۔ لیکن معلوم ہے کہ مولانا نے کبھی ان کے کام کے خلاف قلم نہیں اٹھایا۔ ایسی صورت میں ادبی میدان میں مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

برگ گل کے بابائے اردو نمبر میں ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"پھر تقسیم ملک کے بعد جو قیامت دہلی اور انجمن پر ٹوٹی اس کا سب کو علم ہے۔ اقبال کی بصیرت نے تو بہت پہلے دیکھ لیا تھا لیکن خود مولوی صاحب کو بھی یہ روزِ بد دیکھنا پڑا کہ اپنے ہی گھر اور دفتر میں فوجی پہرے داروں کی نظر بچا کر انھیں بعض پسندیدہ مخطوطات کو اپنے کپڑوں میں چھپا کر لے جانا پڑا کہ اپنے ایک قدیم کرم فرما مولانا ابوالکلام آزاد کی شانِ میزبانی کی اس طرح پذیرائی کرنی پڑی کہ ایک طرف مولانا آزاد کی کوٹھی مختلف مہمانوں کے قہقہوں سے گونج رہی ہے اور کلام و طعام کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور دوسری طرف ایک خاموش کمرے میں مولوی عبدالحق اپنے "کھانے کا انتظار کر رہے ہیں یہ باتیں بہت چھوٹی ہیں اور ان پر شاید ہی کسی کو یقین آئے اور ہو سکتا ہے کہ وسیع مشرب اور وسیع دسترخوان مولوی عبدالحق بھی ان باتوں کو من گھڑت کہہ کر ٹال جائیں، لیکن ایک خضر صورت بزرگ کا محض اپنے ذوقِ علم کی تسکین کے لیے چند مخطوطات کا کپڑوں

میں چھپا کر لے آنا اور نازک حالات میں مولانا آزاد کی مصلحت اندیشی کی وجہ سے ان کا ایک گوشے میں خاموش بیٹھے رہنا، یہ اتنی عجیب اور غیر معمولی باتیں ہیں کہ اگر واقعی یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا تو جی یہی چاہتا ہے کہ کاش ایسا ہو سکتا۔" ص ۱۵۷

ان سطروں میں ابوالکلام کی شانِ میزبانی اور مولوی عبدالحق کی کس مپرسی کی جس حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اگر کسی کی تمنا تھی تو بے شک اسے ماتم ہی کرنا چاہیے لیکن اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے نہ کبھی ابوالکلام آزاد کی میزبانی کی یہ شان رہی نہ مولوی صاحب مرحوم اس کس مپرسی کی حالت میں کبھی رہے۔

ابوالکلام آزاد کی کوٹھی، قہقہوں کا گونجنا، انواع و اقسام کے کھانوں کی تیاری، خوشبوؤں کا پھیلنا، مولوی صاحب کا ایک کونے میں دبکے بیٹھے رہنا، مخطوطات کو کپڑوں میں چھپا کر لے جانا وغیرہ اگر یہ بطور واقعہ نقل کیا گیا ہے تو اس کا سر عنوان صرف ایک لفظ "جھوٹ" ہی ہو سکتا ہے اور اگر یہ کوئی افسانہ ہے تو مصنف کے عجزِ فن کا شاہ کار۔ اور جیسا کہ عرض کیا اگر یہ مضمون نگار کی تمنا ہے تو اس درجہ افسوسناک کہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تمنا کی مثال شاید ہی پیش کی جا سکے۔ مضمون نگار نے یہ واقعہ شاید مولوی صاحب کی محبت میں اور ابوالکلام آزاد کے خلاف پیش کیا لیکن فی الواقع وہ جس درجہ ابوالکلام کے خلاف ہے اس سے زیادہ خود مولوی عبدالحق کے خلاف ہے۔ (قومی زبان، کراچی، بابائے اردو نمبر ۱۹۶۶ء)

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے پاکستان آجانے کے بعد ہندوستان میں انجمن ترقی اردو کی زندگی کا از سرِ نو سر و سامان فراہم کر دیا گیا۔ اور وہ کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ اپنے علمی کاموں اردو کے فروغ اور اردو تحریک کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو گئی۔ اگر انجمن ترقی اردو ہند کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس نے پاکستان کی انجمن کے مقابلے میں زیادہ بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اردو تحریک کے اہم نتائج پیدا کیے ہیں۔ اس کی ان خدمات میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رہنمائی کا بڑا حصہ ہے۔

مولانا ابوالکلام ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کے رکن انتظامی مقرر ہوئے تھے اور اردو کی خدمت کے سفر کا آغاز کیا تھا اس کے بعد سے وہ قیام پاکستان تک انجمن کی مجلس نظما کے رکن رہے بابائے اردو کے پاکستان چلے آنے کے بعد تو وہ انجمن کے سب سے بڑے مربی تھے۔ انھوں نے صرف انجمن کی بقا و استحکام ہی کے لیے سر و سامان نہیں کیا بلکہ اردو کے مسئلے کے حل کے لیے بھی وہ زندگی بھر کوشاں رہے۔ ان کی زندگی کی آخری تقریر بھی اردو ہی کے مسئلے پر تھی۔

ضمائم

اس مضمون میں جن تحریروں کے حوالے آئے ہیں ان میں سے بعض تحریروں کو یہاں مرتب کر دیا گیا ہے کہ ان کی بھی افادیت معلوم ہے۔

(۱)

سچی حکایت

(بابائے اردو)

کئی سال ہوئے مجھے کلکتے جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن میں اور عبدالرحمن صدیقی مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گئے۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد مولانا نے ایک تقریر شروع کی کہ ہمیں اپنی زبان میں عربی فارسی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ کا استعمال ترک کر دینا چاہیے اور سہل اور سادہ زبان استعمال کرنی چاہیے۔ ورنہ اردو زبان کی ترقی رک جائے گی وغیرہ وغیرہ

جب ذرا دیر ہوگئی تو صدیقی صاحب نے کہا "مولانا کیا آپ نے سگریٹ پینا ترک کر دیا ہے؟ اس پر مولانا نے فرمایا "معاف کیجیے گا ذہول ہو گیا"۔ اور یہ کہتے ہی لپک کر وہ دوسرے کمرے میں سگریٹ لینے چلے گئے۔ صدیقی صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ مولانا نے کیا کہا؟ میں تو کچھ سمجھا نہیں۔ میں نے کہا مولانا کا مطلب یہ تھا کہ میں بھول گیا۔ صدیقی صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے کیا یہی سادہ اردو ہے۔ (قومی زبان: بابائے اردو۔ ۲۲ر جون ۱۹۴۸ء)

(۲)

ایک دلچسپ ملاقات

محی الدین احمد

"مولوی صاحب مرحوم کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ اکثر اشخاص کو بار بار دیکھنے کے بعد بھی بھول جاتے ان میں وہ اشخاص بھی شامل تھے۔ جو معمولی حیثیت

سے ہوں اور وہ بھی جن کی شخصیت غیر معمولی طور پر بلند ہو چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ـــ

وہ ایک موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی بھول بیٹھے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب اکثر تعطیلات گرما میں مولوی صاحب کے پاس اورنگ آباد دورہ جاتے اور اردو باغ میں قیام کرکے اپنے علمی کاموں کی تکمیل کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک بار اورنگ آباد آئے اس زمانے میں ڈاکٹر انصاری کے پاس سے دعوت نامہ پہنچا کہ ان کے یہاں شادی کی تقریب ہے اس لیے اس میں شریک ہونے کے لیے ڈاکٹر عابد حسین اور مولوی صاحب دونوں تشریف لائیں پس مولوی صاحب ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر ایسے وقت پہنچے جب کہ دسترخوان تیار تھا اور جو مہمان ان کے گھر پر مقیم تھے کھانا کھانے کی تیاری میں مصروف تھے مولانا آزاد نے مولوی صاحب کو دیکھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس پر مولوی صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کو پہچانتا ہوں لیکن حقیقت یہ تھی کہ مولوی صاحب ان کو مطلق نہ پہچان سکے تھے۔ بات گزر گئی جب دسترخوان پر بیٹھے تو اتفاق سے مولانا آزاد مولوی صاحب کے روبرو تھے۔ انھوں نے پھر مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ اب مولوی صاحب چکرائے اور آہستہ سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے دریافت فرمایا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے بتایا کہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اس پر مولوی صاحب نے فرمایا آپ کو کون نہیں پہچانتا کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اب خواجہ غلام السیدین صاحب نے مذاقاً فرمایا کہ مولوی صاحب آپ نے بالکل نہیں پہچانا یہ آزاد نہیں یہ تو عبدالمجید سالک ہیں اب مولوی صاحب بہت پریشان ہوئے اور پھر ڈر کر عابد حسین صاحب کی طرف دیکھا۔ انھوں نے چپکے سے کہا کہ نہیں یہ ابوالکلام آزاد ہی ہیں لیکن مولوی صاحب کی الجھن اور بار بار ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی طرف دیکھنے سے لوگوں نے تاڑ لیا تھا کہ مولوی صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کو پہچان نہ سکے تھے۔ یہ واقعہ ایک بار انھوں نے خود بیان فرمایا تھا۔"

(قومی زبان، بابائے اردو نمبر ۶۲ء)

(۳)

آزاد ہندوستان کی قومی زبان

محمد اسماعیل ذبیح

ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ہی (نینی سینٹرل جیل، الہ آباد میں) گول چکر کی بارک میں رہتے تھے مولانا سے مسائل جنگ کے علاوہ ہندوستانی سیاست اور ہندو مسلم معاملات پر بھی طویل بحث کرتے تھے اور ان دونوں کی معرکہ آرا گفتگو سننے کے لیے چپ چاپ اچھا خاصا مجمع لگ جاتا تھا مگر آخر میں ڈاکٹر کاٹجو صاحب مولانا کے دلائل کو تسلیم کر لیتے تھے ایک چیز جس پر ڈاکٹر کاٹجو صاحب اور مولانا آزاد میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا وہ آزاد ہندوستان میں زبان کا مسئلہ تھا مولانا اس ہندوستانی کو قومی زبان بنانے پر اٹل تھے جو ایک طرح بولی جاتی مگر دیوناگری اور فارسی تحریروں میں لکھی جاتی ہے کاٹجو صاحب ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندی کو بنانا چاہتے تھے جس کا رسم الخط بھی صرف دیوناگری ہو مگر اس وقت ان کی یہ فراخ دلانہ پیش کش بھی تھی کہ اردو کو بہر حال ہندی کے بعد دوسرا درجہ دیا جائے گا اور سرکاری کاموں میں چاہے لاکھوں روپے کا مزید صرف کیوں نہ ہو اردو کو اہم حیثیت حاصل ہو گی۔ وہ اس پر بھی تیار تھے کہ ہندوستان کا دستور اور تمام آئینی کارروائیاں اردو میں بھی ہوں۔ (ہفت روزہ چٹان لاہور۔ ۱۸ راپریل ۱۹۵۵ء)

(۴)

ایک خاص ذہنیت اور قومی زبان کا مسئلہ

ابوالکلام آزاد

جب میں نے دیکھا کہ انڈین یونین میں مسلم لیگ کے ختم ہو جانے اور اس کے نقطۂ نظر کے مردہ ہو جانے کے بعد بھی ایک دو اصحاب کے سوا صاف دماغی سے غور کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے اور قومی زبان کے مسئلے میں دلیل اور فہم و فراست سے کام لینے کے بجائے غلط جذبات کی پیروی کی جا رہی ہے اور انہیں جذبات پر اصرار کیا جا رہا ہے تو میں نے ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور یہ لکھ دیا کہ اس مسئلے میں خدمت نہیں کر سکتا۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میں نے حق بات کہنے میں کبھی ان لاکھوں ہم مذہبوں کی بھی پروا نہیں کی جو مجھے بت کی طرح پوجنے کے لیے تیار تھے۔ میں نے اُن کی گالیاں سنیں اور آج تک سُن رہا ہوں۔ اس لیے میں اس وقت بھی صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر ہاؤس نے اپنے ووٹوں کی اکثریت سے اس مسودے کے مطابق فیصلہ کر دیا تو یہ حد درجے تنگ ذہنیت کا مظاہرہ ہو گا اور ایک ایسا فیصلہ ہو گا جس سے زیادہ غلط اور بُرا کوئی دوسرا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ بیچ کی راہ وہی تھی جس کو میں نے پچھلے اجلاس میں دلائل کے ساتھ واضح کیا تھا کہ ہندستانی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو سرکاری حیثیت دیتے ہوئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سرکاری اطلاعات اور کورٹ میں درخواستیں وغیرہ اُردو میں بھی دی جا سکیں اور قبول کی جائیں"۔ (کانگریس اسمبلی پارٹی کی میٹنگ میں تقریر) (قومی زبان ۱۶ راکتوبر ۱۹۴۹ء)

(۵)

مولانا ابوالکلام کی ایک پیش گوئی مولوی عبدالحق پر کیا گزری

پاکستان آنے کے بعد مولوی صاحب کو بڑے مصائب جھیلنے پڑے اور بڑی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا۔ پاکستان میں اردو کے رواج و نفاذ اور انجمن ترقی اردو کے فروغ و ترقی کے بارے میں انھوں نے جو کچھ سوچا تھا، وہ سب خواب و خیال ثابت ہوا۔ ہر دو محاذوں پر انھیں ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مولوی صاحب نے اس کی پوری روداد "اردو کا المیہ" اور "انجمن ترقی اردو کا المیہ" نامی دو رسالوں میں مرتب کر دی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے احباب کے نام خطوط میں بھی یہ تمام حالات بیان ہوئے ہیں پاکستان میں اردو کے مخلصین نے اردو کے لیے جو مشکلات پیدا کر دی تھیں اس کے لیے "اُردو کا المیہ" دیکھنا چاہیے۔ انجمن کے مخلصین نے خود انجمن کو تباہ کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اور مولوی صاحب کے نیاز مندوں نے مولوی صاحب کی زندگی کو جس طرح اجیرن کر دیا تھا اس کے تفصیلی مطالعے کے لیے "انجمن کا المیہ" دیکھنا چاہیے لیکن اس کا اندازہ تو مولوی صاحب کے ایک خط اور ہفت روزہ لیل و نہار لاہور کے مضمون سے بہ خوبی ہو جاتا ہے۔ لیل و نہار سے یہ خط اور مضمون کا اقتباس علامہ نیاز فتح پوری نے نگار لکھنؤ میں اپنے ادارتی نوٹ اور نئے عنوان سے نقل کیا تھا۔ اسے درج کیا جاتا ہے۔

"تقسیم ہند کے بعد جب دہلی میں قتل و غارت گری شروع ہوئی تو انجمن ترقی اردو کا کتب

خانہ محض مولانا ابوالکلام کی وجہ سے بڑی حد تک محفوظ رہا اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے یہاں کے حالات سے متاثر ہوکر پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور مولانا ابوالکلام سے مشورہ لیا۔ مولانا نے کہا کہ "آپ یہیں رہ کر اپنے کام میں مصروف رہیے۔ پاکستان میں آپ کو کبھی اطمینان سے کام نہ کرنے دیا جائے گا۔" لیکن مولوی عبدالحق نے اس خیال سے کہ پاکستان میں ان کی زیادہ قدر افزائی ہوگی، مولانا آزاد کی اس پیش گوئی کو اہمیت نہیں دی اور کراچی چلے گئے لیکن اب دس سال کے بعد پتا چلا کہ مولانا آزاد کی پیش گوئی کس قدر صحیح و درست تھی۔ اس سلسلے میں سہ ہی کا "لیل و نہار" ملاحظہ ہو۔ جس کے ایک مضمون کا اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ (اڈیٹر)

خود ان کا ایک مکتوب

"کم و بیش ڈیڑھ سال سے علمی ادبی کام معطل ہے۔ انجمن ایسے نا اہل ہاتھوں میں جا پڑی ہے جن کو علم و ادب سے کچھ لگاؤ نہیں۔ البتہ جوڑ توڑ، سازش، تفرقہ پروری سے خاص دلچسپی ہے، انجمن کا روپیہ بے دردی سے ضائع کیا جا رہا ہے اور خلافِ آئینِ انجمن نئی غیر ضروری آسامیاں قائم کرکے دوست نوازی کی خاطر ناکارہ لوگوں کا تقرر کیا جا رہا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ لوگ کون ہیں! یہ وہ حضرات ہیں جن کی بدعنوانیوں کو میں نے روکنا چاہا اور جن کے حالات و حسابات کی تنقیح کے لیے میں نے تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا اور جس کی رپورٹ باوجود مطالبے کے انھوں نے دبا رکھی ہے، اب وہ اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لیے انجمن میں تفرقہ اندازی کر رہے ہیں، ان صاحبوں نے اس عرصہ میں مجھے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں اور ایسی عامیانہ اور چھچھوری حرکتیں کیں جو ناقابل برداشت حد کو پہنچ گئی ہیں انتہا یہ ہے کہ میرے ذاتی کتب خانے کو بھی مقفل کرکے سر بمہر کر دیا ہے تاکہ جو کام میں اور میرے ساتھی اور دوسرے اصحاب کر رہے ہیں نہ کرنے پائیں ہمارے تمام مسودے (مکمل اور نامکمل) کتب خانے میں بند ہیں۔ یہ سوچ سمجھ کر اس ادعا کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ کہ ہم عبدالحق کو پے در پے اتنے "شاک" پہنچائیں گے کہ وہ دو تین مہینے میں ختم ہو جائے گا، پھر ہم اس کے کتب خانہ وغیرہ پر قبضہ کرلیں گے، جب انھوں نے یہ دیکھا کہ وہ یہ سب کچھ جھیل گیا اور مرنے کا نام نہیں لیتا تو انھوں نے اپنی اکثریت کے بل پر ترمیم دستور کی ایک

قرارداد مجلسِ نظما میں منظور کر لی اور اس کو عمل میں لانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس نے یہ قرارداد منظور کی کہ عبدالحق کو صدارت سے ہٹا کر سرپرستوں کی فہرست میں ڈال دیا جائے مطلب یہ کہ اسے انجمن سے کوئی واسطہ نہ رہے یہ پہلا قدم ہے۔ دو ماہ کے بعد مجھے نوٹس دیا جائے گا کہ جن دو کمروں میں میرا قیام ہے وہ خالی کر دیے جائیں کیونکہ انجمن کو ان کی ضرورت ہے۔ مجھے تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا میری کوئی املاک ہے نہ کوئی میرا گھر ہے، میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا اس کا جواب مشکل نہیں جب سر سید احمد خاں کو اس کے لائق فرزند نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور اس نے ایک غیر شخص کے گھر میں جا کر انتقال کیا تو اگر یہ حضرات مجھے انجمن سے دھکے دے کر نکال دیں اور میں سول ہسپتال کے فٹ پاتھ پر دم توڑ دوں تو شکایت کا کیا موقع ہے۔

یہ ہے میری پنجاہ سالہ خدمات کا صلہ پاکستان زندہ باد۔"

مولوی عبدالحق کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ جذبات کے آگے کم ہی سپر ڈالتے ہیں۔ لہٰذا جس عالم میں یہ سطور لکھی گئی ہوں گی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کام مولوی عبدالحق کی زندگی کی اساس ہے۔ وہ بے کار رہنا جانتے ہی نہیں۔ جب تک کتب خانہ کھلا تھا وہ برابر دن میں دس بارہ گھنٹے کام میں جٹے رہتے تھے۔ حریفوں کو معلوم تھا کہ کام اور کتب خانہ ان کا آخری حصار ہے لہٰذا جب کالج، اپریس اور دفتر کے محاذوں پر فتحیاب ہو گئے تو کتب خانے کا رخ کیا اور ایک روز اس پر یک طرفہ تالا چڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے احتجاج کیا کہ آپ لوگوں کو اس کا حق نہیں۔ یہ میری کتابیں ہیں۔ میرے سارے مسودے بھی اسی میں ہیں۔ یہیں میں کام کرتا ہوں طالب علم آکر ریسرچ کرتے ہیں۔ لیکن کون سنتا ہے: تالا چڑھے کوئی پانچ مہینے ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب دادرسی کے لیے کبھی کسی بڑے آدمی کے پاس جاتے ہیں۔ کبھی کسی سے مدد مانگتے ہیں لیکن با اثر حریفوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس مہم کو سر کر کے ان کے حریف بہت خوش ہیں۔ اگر کام بند ہوا۔ اگر مولوی عبدالحق ذہنی اذیت کا شکار ہیں۔ اگر طالب علم جن کے امتحان نزدیک ہیں، کتب خانہ بند دیکھ کر نراس لوٹ جاتے ہیں انھیں کیا فکر۔ ان کی قوت کا مظاہرہ تو ہو گیا کہ مولوی عبدالحق جن کو منانے کے لیے خود گاندھی جی اتنے جتن کرتے تھے، ان کے مقابلے میں محض بے بس اور لاچار ہیں۔

حریفوں کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کتابیں خرد برد کر رہے ہیں اور کتب خانہ دراصل

انجمن کا ہے۔ اس بات پر ہنسی آتی ہے کیونکہ اصل پوزیشن سب کو معلوم ہے کتب خانہ خاص، جس کا یہ سارا ذکر ہے، تین کتب خانوں پر مشتمل ہے۔ ایک کا نام ہے ذاتی کتب خانہ عبدالحق۔ اس میں وہ تمام نادر اور قیمتی کتابیں جمع ہیں جو مولوی صاحب نے ساری عمر کی محنت اور بیش قرار صرفے سے جمع کی ہیں اور جس کے لیے وہ سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرے۔ اس کا بیشتر حصہ دہلی کے فسادات میں ضائع ہوا، لیکن اس کا مغز وہ وہاں سے نکال لائے تھے دوسرا کتب خانہ محمد عمر الیافعی صاحب کا ہے جو مولوی صاحب کے پرانے دوست ہیں۔ ان کو پچاس ہزار روپے کی پیش کش ہوئی تھی لیکن انھوں نے بیچنے کی بجائے مولوی صاحب کی نذر کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ مجھے انجمنوں وغیرہ کا بھروسہ نہیں آپ کو ذاتی طور پر سونپ رہا ہوں۔ ایک حصہ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب کی عطا کردہ کتابوں کا ہے انھوں نے بھی واشگاف الفاظ میں بہ تحریر کر دیا تھا کہ یہ کتابیں انجمن کو ہرگز نہیں دی جا رہی ہیں۔ آپ کو دے رہا ہوں۔ ایک اور کتب خانہ جو کتب خانہ عام کہلاتا ہے اور خاصا وسیع ہے۔ مولوی صاحب کے ایک نیاز مند شبر حاتمی صاحب کی ملک تھا۔ وہ ہندوستان واپس چلے گئے اور تحریری طور پر مولوی صاحب کو یہ سونپ گئے۔ اتفاق کی بات ہے عمر الیافعی صاحب، ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب شبر حاتمی صاحب ہر سہ حضرات نے یہ بات بالوضاحت لکھ دی کہ:

۱۔ یہ کتب خانہ انجمن کو ہرگز نہیں دیا جا رہا ہے۔

۲۔ ذاتی طور پر آپ کی نذر ہے۔

اس وقت جب کہ اس قسم کے جھگڑے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ان دستاویزات کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص کتب خانہ کی ملکیت میں شبہ کرے تو اسے سینہ زوری کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ مولوی صاحب اپنا تصنیف و تالیف کا سارا کام کتب خانہ خاص ہی میں کرتے تھے جو ان کے رہنے کے کمروں کے عین نیچے واقع ہے۔ طالب علم بھی وہیں آ بیٹھتے تھے۔ گرمیوں میں چوتھی منزل کی پتلی دیواروں کے کمرے تپ کر آگ ہو جاتے ہیں لہٰذا شام تک کا وقت مولوی کتب خانہ ہی میں گزارتے تھے۔ مگر لوگوں کو اس پیر نود سالہ کی تکلیف اور اذیت کا اتنا بھی خیال نہیں۔

(نگار، لکھنو، جون ۱۹۵۸ء)

(۶)

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عبدالحق کے اختلافات کی نوعیت

تقسیم کے بعد انجمن ترقی اردو کی تشکیل جدید

(ابوسلمان شاہجہان پوری، آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی نے اپنے ایک مکتوب میں پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق اور تقسیم کے بعد انجمن کی تشکیل جدید کے سلسلے میں بعض سوال کیے ہیں، چونکہ ان کا تعلق بعض اہم مسائل سے ہے اس لیے قارئین "ہماری زبان" کی دلچسپی کے لیے ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب کے سوالات اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے جوابات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔ ادارہ ہماری زبان)

ابوسلمان شاہجہان پوری صاحب کے سوالات:

۱۔ مولانا آزادؒ اور مولوی صاحب مرحوم میں اصل بنائے اختلاف کیا تھی؟ انجمن سے متعلق پالیسی کا اختلاف، سرسید اور شبلی اسکول کا اختلاف، مولانا اور مولوی صاحبان کے اپنے اپنے افتاد طبائع اور خاص قسم کے مزاج، ذاتی رنجش یا کوئی اور وجہ؟

۲۔ کیا تقسیم ملک کے بعد ممکن تھا کہ مولوی صاحب دونوں ملکوں میں اردو کی رہنمائی کرتے اور ایک انجمن بیک وقت دونوں جگہ کام کرتی رہتی؟

۳۔ مولوی صاحب کے ہندوستان چھوڑنے سے وہاں اردو کی تحریک کو کیا نقصان پہنچا اگر وہ ہندوستان نہ چھوڑتے تو کیا آج وہاں اردو کا موقف کچھ مضبوط ہوتا؟ نیز کیا پاکستان میں ان کے تشریف لائے بغیر اردو کو وہ مقام نہ ملتا جو اب اس کو حاصل ہے؟

۴۔ کیا پاکستان آتے ہوئے مولوی صاحب انجمن کا کتب خانہ یہاں لے آئے تھے؟ اگر نہیں لائے تھے تو کیا حکومت نے یا مولانا آزاد نے اس میں رکاوٹ ڈال دی تھی؟

۵۔ کیا مولوی صاحب کے پاکستان آنے سے وہاں انجمن ترقی اردو بالکل ختم ہو گئی تھی یا انجمن باقی رہی تھی مولوی صاحب پاکستان آگئے اور انجمن کے لیے سکریٹری کا انتخاب کر لیا گیا؟ یا یہ صورت پیدا ہوئی کہ انجمن ہی ختم ہو گئی اور انجمن ترقی اردو ہند کے نام سے دوسری انجمن تشکیل دی گئی۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے جوابات:

۱۔ جہاں تک میرا علم ہے ذاتی رنجش کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہاں شبلی اور ان کے سلسلے کے سب لوگوں کے متعلق مولوی عبدالحق کی رائے میں عصبیت ضرور پائی جاتی تھی۔ میرے سامنے مولوی عبدالحق نے الہلال کی اردو کو "حرامی اردو" کہا تھا۔ مولوی صاحب ۳۷ء تک قوم پرستوں کے ساتھ تھے لیکن ناگپور میں ہندی ہندوستانی کے قضیے کے بعد سے وہ گاندھی جی، کانگریس اور اس کے رہنماؤں سے نہ صرف اختلاف کا اظہار کرتے رہتے تھے بلکہ مسلم لیگ کے رہنماؤں سے قریب کی وجہ سے تمام قوم پرست رہنماؤں سے بدظن بھی ہو گئے تھے۔

۲۔ تقسیم کے بعد دونوں جگہ کام کرنا ممکن نہ تھا۔ مولوی عبدالحق واقعی یہ چاہتے تھے کہ ایک انجمن دونوں ملکوں میں کام کرے اور وہ کبھی کراچی میں اور کبھی دہلی میں قیام کریں، مگر انھوں نے چونکہ اپنے آپ کو اور انجمن کی اردو تحریک کو بڑی حد تک مسلم لیگ سے وابستہ کر لیا تھا اس لیے مولانا آزاد کا مشورہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں ایک انجمن کے قیام کے حق میں نہ تھا کیونکہ مولوی صاحب کی طرف سے قوم پرستوں کو جو شبہات تھے ان کی وجہ سے ایک انجمن اگر دونوں ملکوں میں کام کرتی اور اور مولوی صاحب کا واسطہ ہوتا تو ہندوستان میں اردو کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچتا۔ میں نے الہ آباد میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مکان پر ان سے عرض کی تھی کہ وہ پاکستان نہ جائیں، اور ہندوستان میں اردو کے لیے کام کریں۔ پاکستان میں اردو کا مستقبل میرے نزدیک ہر طرح محفوظ تھا لیکن ہندوستان میں کام کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اگر مولوی صاحب پاکستان سے کوئی تعلق نہ رکھتے اور ہندوستان میں جم کر کام کرتے تو میرا خیال تھا کہ ان کی دیرینہ خدمات کے پیش نظر شبہات دور ہو جاتے اور ان کے کام کا اعتراف بھی ہوتا لیکن دونوں ملکوں میں ان کے کام کرنے کو میں نے بھی پسند نہیں کیا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے میرے نزدیک ہندوستان میں مولوی صاحب کے موقف کے ساتھ انصاف نہ ہوتا اور شبہات بدستور رہتے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ذاکر صاحب نے بھی مولوی صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستان میں کام کریں اور ہندوستان میں اردو کے تحفظ کا کام یہاں کے دوسرے اردو کے خادموں پر چھوڑ دیں۔

۳۔ مولوی صاحب کے ہندوستان چھوڑنے سے میرے خیال میں اردو کی تحریک کو نہ صرف نقصان نہیں پہنچا بلکہ فائدہ ہی ہوا کیونکہ پھر انجمن کی قیادت ایسے لوگوں نے کی جو مسلم قوم پرست تھے

اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے اردو کی پوزیشن ہندوستان میں تقسیم کے فوراً بعد کے زمانے سے آج زیادہ مضبوط ہے گو ابھی بہت سی کوتاہیاں اور زیادتیاں ہیں مگر اس کے قومی کردار اور مزاج اور قومی اور جمہوری رول کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور اسے ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک قومی زبان مان لیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر آئندہ اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ ان کے پاکستان جائے بغیر اردو کو وہ مقام نہ ملتا جواب اس کو حاصل ہے۔ اس کا جواب پاکستان کے لوگ بہتر دے سکتے ہیں۔ ہاں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولوی صاحب نے مشرقی پاکستان کو اردو سے بیزار کر دیا، اگر بجائے جارحیت کے ایک صلح کل رویہ اختیار کیا جاتا تو شاید بہتر نتائج نکلتے۔ ویسے پاکستان میں اردو کے مستقبل کا مسئلہ مولوی صاحب کی کوششوں کا محتاج نہ تھا۔ رائے عامہ کی تائید اردو کو حاصل تھی۔

۴۔ جب یہ طے ہوا کہ انجمن کے وسائل دونوں ملکوں میں تقسیم کر دیے جائیں تو یہ بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ کتابیں جو مولوی صاحب کی ذاتی تھیں وہ اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ پنڈت کیفی کی جو ذاتی کتابیں تھیں وہ ان کو دے دی گئیں۔ ہاں کتب خانہ چونکہ انجمن کے سرمائے سے خریدا گیا تھا اس لیے یہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند کی ملکیت قرار دیا گیا۔ جہاں تک علم ہے مولوی صاحب اپنی سب ذاتی کتابیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

جب دریا گنج میں انجمن کا دفتر لٹا تو مولانا آزاد نے اس کی حفاظت کے لیے پہرہ مقرر کر دیا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اس کی کئی بار شکایت بھی کی کہ کتابیں دیکھنے میں بھی انھیں دشواری ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ فیصلے کے مطابق انجمن کے کتب خانے کو مولوی صاحب نہ لے جا سکتے تھے۔ ہاں ذاتی کتب لے جا سکتے تھے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ مولانا آزاد نے مولوی صاحب کو اپنی کتابیں لے جانے کے سلسلے میں روکا۔ ان کی ہدایات کے مطابق صرف انجمن کے کتب خانے کو محفوظ رکھنے کا سوال تھا۔ مولوی صاحب اس کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔

۵۔ مولوی صاحب کے پاکستان آنے کے بعد نہ صرف یہاں کی انجمن ختم نہیں ہوئی بلکہ باقاعدہ کام کر رہی ہے۔ جب مولوی صاحب کی موجودگی میں یہ طے ہو گیا کہ انجمن ہندوستان اور پاکستان میں علاحدہ علاحدہ کام کرے گی تو ہندوستان کی انجمن کا صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو مقرر کیا گیا اور وہ اس کا دفتر علی گڑھ لے آئے اور انھوں نے قاضی عبدالغفار کو اس کا جنرل سکریٹری مقرر کیا۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد یہ خدمت میرے سپرد ہوئی جسے میں اب تک انجام دے رہا ہوں۔

انجمن ترقی اردو ہند اور انجمن ترقی اردو پاکستان دونوں پرانی انجمن کی جانشین ہیں۔ دونوں انجمن کی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی مطبوعات چھاپ سکتی ہیں دونوں کا رشتہ پرانی انجمن سے ماں اور بیٹیوں کا ہے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ اگست ۱۹۶۶ء)

(۷)

کچھ مولوی عبدالحق کے سلسلے میں

ہماری زبان کا تازہ شمارہ (۱۵ اگست ۶۶ء) ملا ابو سلمان صاحب کے سوالات اور آپ کے جوابات کو بڑی دلچسپی سے پڑھا میں بحث میں حصہ لینے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے اس خط کو کسی طرح بھی مباحثے میں حصہ لینا نہ سمجھا جائے۔ لیکن مجھے بھی مولوی عبدالحق مرحوم کی خدمت میں رہنے کا کچھ موقع ملا ہے۔ اور انھیں سمجھنے کا بھی بعض باتیں اب جو میرے علم میں ہیں۔ وہ آپ تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔

مولوی عبدالحق صاحب مرحوم اور مولانا آزادؒ میں ذاتی رنجش کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم مولانا آزاد سے رنجیدہ رہتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی تھی۔ جس کا آپ نے ذکر کیا ہے یعنی شبلی اور ان کے سلسلے کے لوگوں سے عصبیت، میں اتنی چھوٹی حیثیت کا آدمی تھا۔ کہ مولوی صاحب سے کوئی سوال کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی بعض مرتبہ ان کی باتیں بری بھی لگتی تھیں اس میں شک نہیں کہ الہلال کی اُردو کو وہ اردو نہیں مانتے تھے۔ اور "حرامی اردو" کہتے تھے۔ لیکن رام گڑھ کانگریس میں مولانا نے جو خطبہ دیا تھا اس کی تعریف بھی میں نے ان کی زبان سے سنی ہے۔

جہاں تک سمجھتا ہوں۔ مولانا آزادؒ سے انھیں دو بڑی شکایتیں تھیں ایک تو یہ کہ مولانا آزاد انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ میں ہونے کے باوجود کبھی کوئی عملی دلچسپی انجمن سے نہیں لیتے تھے اور مولوی صاحب اس کے خواہش مند تھے ________________ اور مولوی صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ مولانا اپنے اثر سے کام لے کر کانگریس کے کارکنوں کو سمجھائیں۔ بتائیں کہ اردو زبان اسی ملک کی زبان ہے یہ آپ کو معلوم ہے کہ مسلم لیگ والوں نے پوری کوشش کی کہ انجمن مسلم لیگ کا لسانی پلیٹ فارم بن جائے لیکن مولوی صاحب نے اس سے اختلاف ہی نہیں کیا۔ بلکہ ایسی بات نہیں ہونے دی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ خود مولوی عبدالحق صاحب نے بتایا تھا وہ

لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس سے پہلے مسٹر جناح نے ایک خط مولوی صاحب مرحوم کو لکھا۔ اور لکھنؤ میں ملنے کی خواہش ظاہر کی مولوی صاحب نے انہیں لکھ بھیجا کہ وہ سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ اس لیے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور وہ لکھنؤ نہیں جائیں گے ظاہر ہے کہ مسٹر جناح مولوی صاحب کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ مسٹر جناح نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو خط لکھا کہ مولوی صاحب کو رضا مند کردو۔ اور انھوں نے مولوی صاحب کو خط لکھا۔ مولوی صاحب کے دل میں اقبال کے لیے بڑا احترام تھا لیکن مولوی صاحب نے انھیں لکھا کہ مسٹر جناح سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں اس خط میں ایک جملہ بڑا با معنی لکھا تھا اس خط کی نقل میں نے دیکھی۔ اور وہ جملہ کچھ اس طرح تھا۔ زبان کا مسئلہ سیاسی لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے۔ گاندھی جی نے زبان کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے الجھا دیا ہے۔ اگر دوسری طرف مسٹر جناح بھی یہی کریں گے۔ تو پھر اللہ ہی مالک ہے۔ اور یہ بھی لکھا تھا۔ کہ مسٹر جناح تو اردو جانتے تک نہیں۔ انھیں اردو سے کیا ہمدردی اور دلچسپی ہوسکتی ہے۔ لیکن گفتگو میں ہم لوگوں سے صاف لفظوں میں بولے کہ وہ انھیں سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن اقبال نے انھیں دوسرا خط لکھا۔ اور لکھا کہ بات کرنے اور ملنے میں تو کوئی ہرج نہیں۔ اس پر مولوی عبدالحق لکھنؤ گئے اور مسٹر جناح سے ملے۔ لیکن دونوں کا شدید اختلاف ہوگیا۔ اور مولوی صاحب خفا ہو کر چلے آئے۔

مولوی صاحب مرحوم نے خفگی کی وجہ بھی بتائی تھی۔ وجہ یہ ہوئی۔ کہ جب مسٹر جناح سے باتیں ہوئیں۔ تو مولوی صاحب نے سب سے پہلی شرط لگا دی۔ کہ پہلے مسلم لیگ اس مضمون کی تجویز منظور کرے کہ ہندوستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔ خود مولوی صاحب نے تجویز کا مسودہ تیار کیا۔ اسے نواب صدیق علی خاں نے مجلس مضامین میں پیش کیا۔ لیکن مولانا اکرم خاں (بنگال) اور دوسرے بنگالیوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مولوی صاحب کو یہ بات بے حد ناگوار ہوئی۔ مسٹر جناح نے کہا کہ وہ عام اجلاس میں کرسی صدارت سے اس تجویز کو پیش کریں گے اور منظور کرالیں گے۔ لیکن مولوی خفا ہو کر چلے آئے چنانچہ اس کے بعد سے مولوی صاحب مرحوم کو مولانا اکرم کے نام سے نفرت سی ہوگئی تھی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اردو زبان کا معاملہ مولوی صاحب کے لیے مذہب سے بھی زیادہ اہم تھا۔ چنانچہ وہ بے حد خفا تھے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ کانگریس سے وہ بے حد بدگمان تھے۔ اور دوسری طرف بہت سے مسلم لیگی ان کے گرد اکٹھا ہونے لگے تھے خاص کر لیاقت علی خاں، جو

اس وقت دلی کے علی گڑھ اولڈ بوائز کے سکریٹری اور مولوی صاحب صدر تھے۔ نواب صدیق علی خاں۔ اور خود انجمن کے دفتر کے اندر کچھ لوگ نہایت ہی متعصب مسلم لیگی تھے۔ اور مولوی صاحب کو لوگ بہکاتے رہتے تھے۔

اردو زبان سے مولوی صاحب کو کتنی محبت تھی اسے آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کا دھرم ایمان سب کچھ اردو ہی تھی، جو اردو کا دوست وہ ان کا دوست اور جو اردو کا دشمن وہ اُس کے دشمن، ان کا یہ رویہ آخری وقت تک رہا۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہوا۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کے بیانات سے اندازہ کیجیے۔ ظاہر ہے کہ مشرقی پاکستان میں اردو کے خلاف ہنگامہ کرنے والے مسلم لیگی اور بنگالی مسلمان تھے کانگریسی اور ہندو نہ تھے۔

ان کے بعض ہندو اور کانگریسی دوست بھی تھے جو اردو کے حامی تھے۔ پنڈت سندر لال، پنڈت بنارسی داس چترویدی مولوی صاحب کے بعض ہندو دوست ایسے بھی تھے جو مہابھائی تھے لیکن چونکہ اردو زبان کے معاملے میں ان کے ساتھ تھے۔ اس لیے انھیں بے حد عزیز تھے۔ مثلاً سر گوکل چند نارنگ اور پنڈت ونشی دھر ودیالنکار۔

مولوی صاحب کو جب سے مجھے جاننے کا اتفاق ہوا میں یہی سمجھا کسی سے ان کی محبت اور نفرت ذاتی بالکل نہیں تھی۔ بلکہ صرف اردو زبان کے واسطے سے تھی۔

مولوی صاحب مرحوم میں ایک بڑی کمزوری تھی۔ جو منہ میں آتا تھا دو ٹوک بول دیا کرتے تھے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولوی صاحب کانگریسی تو ہرگز نہیں تھے۔ اور قوم پرست مسلمانوں سے بھی خفا رہتے تھے لیکن وہ مسلم لیگی بھی نہیں تھے کم سے کم جب تک ہندوستان میں تھے پاکستان جانے کے بعد بھی انھوں نے جو خطوط مجھے لکھے۔ ان میں مسلم لیگی ہونے کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ بلکہ کچھ اور باتیں ملتی ہیں مایوسی زیادہ ہے۔ (ایک واقف کار)

(ہماری زبان علی گڑھ، ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء)

(۸)

مورخہ ۱۵ اگست ۶۶ء کے "ہماری زبان" میں ابو سلمان شاہجہانپوری کے چند سوالات اور آل احمد سرور صاحب کے جوابات نظر نواز ہوتے ہیں جوابات میں سرور صاحب مولوی عبد الحق صاحب مرحوم کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ الہلال کی اردو کی نسبت سرور صاحب سے کہا تھا کہ الہلال

کی اردو "حرامی" اردو[1] ہے یہ پڑھ کر میری حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی عقل کبھی باور نہیں کرتی کہ مولوی موصوف سے مولانا آزاد کی اردو ——— کی بابت اس قدر گندہ اور کثیف کلمہ کیوں کر سرزد ہوا۔ مولانا آزاد کے تبحر علمی اور اردو لغت و ادب پر اُن کا ید طولیٰ اور بلند پائیگی دنیا بھر میں مشہور و معروف ہے حتیٰ کہ اس شمع ادب سے اپنے چراغ روشن کرنے کے کم و بیش سبھی ادیب و نثار خواہاں ہیں۔ اپنی عدیم النظیر نگارشات سے مولانا نے اردو کی جو گراں بہا اور غیر فانی خدمات انجام دی ہیں اس سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔

اور مولوی عبدالحق صاحب نے تو اپنی زندگی تک اُردو کی ترقی و بہبود کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ جہاں تک میرا ناقص علم ہے اردو کی بہبودی کے لیے مولوی موصوف ہر قسم کی قربانی کو بخوشی آمادہ تھے میں نہیں سمجھتا کہ اس راہ پر گامزن ہونے میں مذہب و ملت، سیاست و قومیت وغیرہ ان کے لیے سد راہ ہوئی ہو۔ پھر یہ کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ مولوی صاحب کے لب مبارک سے ایسا فاحش کلمہ ادا ہوا ہو جو کسی تعلیم یافتہ مہذب انسان کے لیے زیبا نہیں دیتا اور اس پر طرہ یہ کہ یہ سوقیانہ اہانت آمیز کلمہ مولانا آزاد کی اردو پر مستعمل ہوا ہے۔

اور جناب سرور صاحب پر دروغ گوئی کا الزام لگانا بھی نازیبا معلوم ہوتا ہے میرے خیال میں بہت ممکن ہے کہ سرور صاحب کو کہیں سننے میں دھوکہ ہوا ہو۔ مولوی عبدالحق صاحب نے جو ہر ادیب کی حوصلہ افزائی اپنا فرض سمجھتے تھے غالباً الہلال کی اردو کی نسبت "عوامی" اردو کا کلمہ استعمال کیا ہوگا۔ سرور صاحب عوامی کو "حرامی" سمجھ بیٹھے ہوں گے ورنہ اور کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔

(ایس۔ ایم۔ سرور۔ ملاپرم کیریلا) (ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء)

⑨

یقین ہے کہ مولوی صاحب نے "حرامی" کا لفظ ضرور استعمال کیا ہوگا۔ لیکن یہ بھی یقین ہے کہ محض ازراہِ تفنن و شوخی استعمال کیا ہوگا۔ وہ اپنی نجی کی مجلسوں میں نہ صرف شوخ بلکہ بعض اوقات پھکڑ واقع ہوئے تھے لیکن تحریر میں وہ بہت محتاط تھے چنانچہ یہ لفظ بھی انھوں نے نجی کی مجلس میں استعمال کیا

---

[1] جو لوگ مولوی عبدالحق مرحوم کو اچھی طرح جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ مولوی صاحب گفتگو میں بعض اوقات بڑی شوخی اور بے باکی سے کام لیتے تھے مولوی صاحب نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے اس میں "علائی" اور "حرامی" کا تضاد بھی مد نظر تھا۔

(ادارہ "ہماری زبان")

تھا، نہ کہ کسی سنجیدہ تحریر میں۔ یہاں سرورؔ صاحب جو بات سمجھانا چاہتے ہیں اور مولوی صاحب مرحوم کے ذوق و مزاج کے جس پہلو کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، ضروری تھا کہ وہ اسی طرح صاف صاف لکھ دیتے۔

یہ بات نہیں ہو سکتی کہ مولوی صاحب الہلال کے مقصد اور اس کی نوعیت سے ناواقف ہوں کہ الہلال ایک دعوتِ انقلاب کا ترجمان ہے۔ وہ اردو کا صحیفہ ضرور ہے، اس نے اردو کی ترقی میں بھی حصہ لیا، اردو کو وقار بخشا ہے اور اس کے ادب کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کیا ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں، لیکن اس کے اجرا سے اردو کی ترویج و ترقی اور اسے عام فہم اور مقبول عام بنانا مولانا آزاد کا مقصد نہیں تھا جیسا کہ الہلال سے آٹھ نو سال قبل "لسان الصدق" کا خاص مقصد اردو زبان کی ترقی تھا۔ لیکن مولوی صاحب کی زندگی کا خاص مقصد یہی تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اردو کو سادہ اور عام فہم بنایا جائے تاکہ اسے قبول عام حاصل ہو۔ مولوی صاحب کے ذوق کا تقاضا یقیناً یہی ہو گا کہ الہلال بھی وہی زبان استعمال کرتا جو اُن کے مقصد کے لیے مفید ہوتی۔ لیکن مولانا کی دعوت انقلاب کے لیے کون سی زبان مفید ہو سکتی تھی، اس کا فیصلہ مولانا کو کرنا تھا۔ مولانا کی دعوت کا مخاطب مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ، طبقہ علما یا تعلیم یافتہ طبقہ تھا، اس کے لیے وہی اسلوب مفید ہو سکتا تھا جو ان کے ذوق کے مطابق ہو۔ اور مسلمانوں کا ادبی ذوق اس وقت تک عربی فارسی سے اس درجہ ناآشنا نہ ہوا تھا کہ وہ اس زبان سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔

مولوی صاحب نے اردو کو مقبول عام بنانے میں جو کامیابی حاصل کی اس میں ان کے سادہ اسلوب اور عام فہم زبان کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن مولانا نے اردو کو جو وقار عطا کیا اور تمکنت بخشی، وہ کارنامہ ان کے الہلالی اسلوب کا تھا۔ مولانا آزاد کے اسلوب کی دل ربائی اور انقلاب فکر و عمل میں اس کی افادیت مسلّم، لیکن یہ ایک مصنوعی اسلوب تھا جسے اردو کا ہر ادیب اپنانے سے قاصر تھا۔ یہ اردو کا بنیادی اسلوب نہیں تھا۔ اردو کا بنیادی اسلوب وہی ہے جو سرسید، حالی اور عبدالحق کا اسلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کا اسلوب تاریخ ادب کا محض ایک اثر ہے۔ آج اس کا کوئی استعمال کرنے والا نہیں۔ الہلال کے دور کے بعد انھوں نے خود ہی اسے ترک کر دیا تھا۔ الہلال کے بعد تذکرہ ایک مستثنیٰ مثال ہے، یا غبار خاطر کے صرف چند خطوط میں اس اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے، جب کہ مولوی صاحب کا اسلوب آج تمام ادبیات پر اور اردو کے ہر گوشہ علم و فن میں چھایا ہوا نظر آتا ہے۔

(ابوسلمان شاہجہان پوری)

مولانا آزاد اور علامہ وحشت

ڈاکٹر وفا راشدی

"ذکر آزاد" میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کے کلکتہ کے بعض دوستوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور ان میں شفاء الملک حکیم سید محمد صادق لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، مویدزادہ آغا جلال الدین، ڈپٹی نجم الدین، قطب الدین احمد، قاضی نورالانام، فضل الدین احمد، ایک امام صاحب (جن کا نام مولانا ملیح آبادی کو یاد نہیں رہا تھا۔ یہ لگ اسٹریٹ، کلکتہ کی مسجد کے امام تھے) اور خان بہادر رضا علی وحشت کے نام شامل ہیں۔ اس فہرست میں مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کا نام ضرور شامل ہونا چاہیے تھے کہ وہ کلکتہ میں مقیم اور اس وقت سے کہ مولانا آزاد ہنوز تعلیم سے فارغ نہ ہوئے تھے، واقف تھے۔ وہ مولانا کے علمی و دینی افکار کے مربی تھے اور مولانا کے انقلاب فکر میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

ان میں سے بعض حضرات مثلاً رنجور مرحوم، ڈپٹی نجم الدین، فضل الدین احمد مولانا سے عمر میں بہت بڑے تھے مولانا آزاد کی ذہانت وفطانت نے انھیں مولانا سے قریب کر دیا تھا اور ان کی محبت وقدر افزائی نے مولانا سے دوستانہ علاقہ پیدا کر دیا تھا۔ دوسرے حضرات اور مولانا کی عمروں میں اتنا فرق نہ تھا۔

مولانا ملیح آبادی نے ان بزرگوں سے مولانا آزاد کے تعلقات اور بے تکلیفوں کے دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ لیکن وحشت مرحوم (ف ۱۹۵۶ء) کے بارے میں یہ لکھ کر آگے بڑھ گئے:

"حضرت وحشت اس قدر مشہور ہیں کہ تعارف کرانا غیر ضروری ہے۔ نیکی اور شرافت کی زندہ تصویر تھے۔ موصوف سے میری بھی علیک سلیک تھی۔"

ضرورت تھی کہ حضرت وحشت اور مولانا آزاد کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی جاتی۔ ڈاکٹر وفا راشدی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور دونوں بزرگوں کے تعلقات پر یہ مضمون تحریر فرمایا۔ (شاہجہان پوری)

یہ اس زمانے کا ذکر ہے، جب شہر کلکتہ شعروادب کا گہوارہ، تحریک وسیاست کی آماجگاہ اور علوم وفنون کا مرکز تھا، ارباب فکر و دانش اور اہل علم وفضل کی قدریں تھیں۔ بڑوں کا احترام تھا، وضعداری وشرافت کا پاس تھا، اسلامی تہذیب وثقافت اور روایتی ودینی قدروں کا دور دورہ تھا، قول وعمل، کردار واقدار کی بلندی ہماری قوم مسلم کا سب سے نمایاں جوہر تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد،

خان بہادر علامہ رضا علی وحشتؔ کلکتوی، نظمؔ طباطبائی، نواب عبداللطیف، عبدالغفور خاں نسّاخ اور سید امیر علی جیسی علمی و ادبی شخصیتوں کے افکار و خیالات، ارشادات و نگارشات کے نور و ظہور سے فضائے کلکتہ منور و درخشاں تھی۔ اس لیے مولانا آزاد اور مولانا وحشت کا ذہنی ارتقاء اور علمی ادبی ذوق کی نشو و نما کم و بیش ایک ہی ماحول میں ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی نظریات کیا تھے؟ ان کا سیاسی مقام کیا تھا؟ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، گفتگو یہ ہے کہ اس ذوق نے دونوں پروانوں کو شمع ادب کے عشق میں کس طرح سوختہ جاں رکھا، اور ایک دوسرے کو کتنا قریب کیا اس کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مولانا آزاد طبعاً و فطرتاً پہلے شاعر، پھر خطیب، امام، صحافی، نثر نگار، انشاء پرداز، مفکّر و مدبّر اور دانشور تھے اور بعد میں سیاستدان وہ علوم و فنون کے بحرِ بیکراں تھے —— سیاسی زندگی ان کی حیات تک زندہ تھی، لیکن علم و ادب کے جو چراغ انھوں نے فروزاں کیے، ان سے کتنے ہی چراغ جلے، اور جلتے رہیں گے یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ذوقِ شاعری سے ہوا، وہ اول تا آخر صاحبِ دل، صاحبِ ذوق، اور صاحبِ نظر تھے، یہی وہ دلکش و دلگداز پہلو تھا، جس نے وحشتؔ کو ان کا شیدا و گرویدہ بنا دیا تھا۔

مولانا آزاد ابتداء میں شعر و سخن سے خاصا شغف رکھتے تھے۔ آزادؔ تخلص کرتے تھے، اپنی ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

یہ بھی قیدی بن گیا آخر کمندِ زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزادؔ شامل ہو گیا

مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی دور میں شاعری اور مشاعروں کی نسبت سے کلکتہ کے کئی اربابِ ذوق سے دوستی تھی، جن میں مولانا رضا علی وحشتؔ کو اوّلیت حاصل تھی، مولانا آزاد کا سنہ پیدائش ۱۸۸۸ء اور مولانا وحشت کا سال ولادت ۱۸۸۱ء ہے، اس طرح آزادؔ وحشتؔ سے عمر میں سات سال چھوٹے تھے لیکن علمی و ادبی حلقوں میں یکساں مقبول تھے، دونوں کے دوستانہ تعلقات تھے، ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے، خوش قسمتی سے خاکسار نے ان دونوں بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، دونوں کی صحبتوں سے فیضیاب ہونے کا شرف حاصل کیا ہے، اس ناچیز نے وحشتؔ کو آزادؔ کے بالی گنج والے مکان میں اور مولانا آزاد کو وحشت کے دیلیلی

اہرپٹ والے گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے، یہ بات ان حضرات کے دورِ بزرگی اور راقم کے کم سنی کے زمانے کی ہے، یہاں ذکر آزادؔ اور وحشتؔ کی نوجوانی کے زمانے کا ہوگا، اکثر ادبی انجمنوں، جلسہ گاہوں اور مشاعرے کی محفلوں میں ساتھ ہوتے ایسی نشستوں میں وحشتؔ کے اُستاد ابوالقاسم مظہر الحق شمسؔ فرید پوری بھی شریک ہوتے تھے آزادؔ، حضرت شمسؔ سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے، آزادؔ نے ایسی صحبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنی ایک کتاب "آزادؔ کی کہانی خود آزادؔ کی زبانی" مطبوعہ مکتبۂ چٹان لاہور (ص ۴۶-۴۷) میں بیان فرماتے ہیں:

"اُس زمانے میں کلکتہ میں عام نومشق لوگوں کے شمس مرحوم بحیثیت اُستاد کے سمجھے جاتے تھے، وہ نساخؔ مرحوم کے لڑکے تھے اور نواب عبداللطیف کے بھتیجے تھے۔ داغؔ مرحوم کے شاگرد تھے، اس میں شک نہیں کہ بنگال میں ان سے بہتر اُردو پر قدرت رکھنے والا کوئی شاعر نہیں ہوا، وہ ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور بڑی تعریف کرتے تھے۔ اس زمانے میں رضا علی وحشتؔ بھی نئے نئے شعر کہنے لگے تھے اور شمسؔ مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔

اُس زمانے کی مدہوشیاں بھی عجیب تھیں یہ چیزیں بہت کامیاب معلوم ہوتی تھیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ مشاعرے ہی کیا تھے اور ان میں جو لوگ شریک ہوتے تھے، ان کی تحسین و تعریف کیا مفید ہو سکتی تھی۔ بے چارے سب کے سب یہیں کلکتہ کے نومشق لوگ ہوتے تھے بجز شمسؔ مرحوم کے۔ اور کوئی شخص کلکتہ میں وقیع حیثیت شاعری میں نہیں رکھتا تھا، ہاں البتہ کہنہ مشق لوگوں میں شہرتؔ مرحوم ایک خاص شخص تھے، لیکن جو کچھ بھی ان میں تھی، کہنہ مشقی اور پرگوئی تھی، ورنہ نہ تو کوئی خاص رنگ تھا اور نہ شاعری کا خاص ذوق —— البتہ بتدیوں میں رضا علی وحشتؔ اس وقت بھی بہت اچھا کہنے لگے تھے اور کچھ شک نہیں کہ روز بروز ان کا ذوق ترقی کر رہا تھا۔ ایک اور مشاعرہ جو طالبؔ مرحوم ہی کی تحریک سے ان کے بعض دوستوں نے کیا تھا اور طرح تھی، "ادھر دیکھ رہے ہیں، اُدھر دیکھ رہے ہیں" وہ کلکتہ کے عام مشاعروں کے اعتبار سے ایک خاص مجلس تھی، طالبؔ مرحوم کے علاوہ پٹنہ اور لکھنو کے بھی بعض شعرا موجود تھے، شوقؔ نیموی بھی ڈھاکہ جاتے ہوئے کلکتہ آگئے تھے اور شریک ہوئے تھے، اس میں خاص طور پر طالبؔ مرحوم نے میرے مطلع کی اس قدر تعریفیں کیں کہ میرا دماغ آسمان پر چڑھ گیا حالانکہ وہ مطلع اب میں سوچتا ہوں تو وہ نہایت معمولی تھا، اس مشاعرے کی غزلیں انھوں نے دلّی میں ایک گل دستہ کی شکل میں شائع

کر دی تھیں"۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا آزاد کا شوقِ شاعری جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا، مستعدی سے شعر کہتے تھے، پابندی سے شاعروں سے ملتے۔ بڑے جوش و ولولہ کے ساتھ مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتے"۔ خادم العلماء، بندہ محی الدین احمد المتخلص آزاد دہلوی مقیم کلکتہ" کے نام سے رسائل و اخبارات میں غزلیں، نظمیں، مثنویاں، قطعات، اور رباعیات چھپتی تھیں۔ ارمغانِ فرخ بمبئی، مخزن، لاہور، نیرنگ عالم اور المصباح کلکتہ میں ان کی منظومات شائع ہوتی تھیں، آخر الذکر دونوں رسالے خود مولانا نے خدمت شعر و ادب کی خاطر نکالے تھے، نیرنگ عالم اور المصباح میں مولانا آزاد اور ان کے احباب کی شعری تخلیقات باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں لیکن ان رسائل کو وُہ مقبولیت و شہرت نہ مل سکی، جو مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ کے حصے میں آئی۔

فنِ تقریر و تحریر کو فروغ دینے کی غرض سے مولانا وحشت نے چند علم دوست احباب کے اشتراک سے کلکتہ میں اُنیس الاسلام نام کی ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی، اُس زمانے میں اِس انجمن نے کلکتہ کے حوصلہ مند نوجوانوں کی علمی تربیت کی یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ انجمن اس اعتبار سے تاریخی اہمیت کی حامل تھی کہ مولانا آزاد جیسے یگانہ خطیب اور امام الہند نے اپنے سلسلۂ تقریر کا آغاز "انیس الاسلام" ہی کے سٹیج پر کیا اس واقعہ کا منظر و پس منظر خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

"۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا اور حداثتِ سن علماء سے دو بدو گفتگو کرنے میں مانع نہ ہوئی، لیکن تقریر کی جرأت نہ کرسکا، تقریباً اسی زمانے کی بات ہے کہ مولوی رضا علی وحشت اور کچھ اور نوجوان طلباء جن سے مشاعروں کی وجہ سے رسم و راہ تھی انھوں نے کڑایہ (آزاد اور وحشت کے محلّوں کے قریب کلکتہ میں ایک سڑک کا نام کڑایہ روڈ ہے یہ اُس سڑک کا ذکر ہے۔) میں ایک انجمن "انیس الاسلام" کے نام سے قائم کی مقصود اس سے تقریر و تحریر کے مذاق کی ترویج و ترقی تھی، نواب شمس الہدیٰ جو اس وقت نواب نہ ہوئے تھے ــــ اس کے صدر تھے، انجمن کے لیے ایک بڑا کمرہ اور ضروری فرنیچر مل گیا تھا، لیکن بڑے جلسے ان کے مکان میں ہوا کرتے تھے سب سے پہلے ایک باقاعدہ لیکچر کی صورت میں تقریر کرنے کا یہیں اتفاق ہوا"۔

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۳۱۹ پاکستانی ایڈیشن)

مولانا آزاد جس جلسے یا مشاعرے میں شریک ہوتے، اس کی رُوداد خود لکھ لیا کرتے تھے، ایک بار مولانا نے "جشن تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ" کے عنوان سے رپورٹ تائمز کے

طرز پہ ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا، یہ مقالہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کی مرتب شدہ کتاب "ارمغانِ آزاد" میں دوبارہ شائع ہوا ہے، مولانا نے یہ مقالہ ایسے دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ کلکتہ کا ادبی ماحول خصوصًا مولانا آزاد اور ان کے ہم عصر شعرا و ادبا کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کا نہایت جاندار، حیات آفریں اور بصیرت افروز عکس نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے، اسے پڑھ کر فرحت اللہ بیگ کا "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، واقعی کلکتے کا وہ مشاعرہ بھی ایک یادگار مشاعرہ تھا جو ۲۵ رجون ۱۹۰۲ کو تاجدار ہند کے جشن تاجپوشی کے موقع پر مولوی عبدالباری رئیس کلکتہ کے مکان پر منعقد ہوا تھا، اس کے بانی و مہتمم مولانا آزاد کے رفیق خاص مولانا محمد یوسف د نجور جعفری چیف مولوی بورڈ آف ایگزامینرز کلکتہ تھے، اس مشاعرے کی دلچسپ کہانی خود آزاد کی زبانی سنیے:

"ابتدا میں اکثر صاحبوں نے غزلیں سنائیں اور جیسا کہ قاعدہ ہے، اپنے کلام کے موافق داد لی اتنے میں جناب شمس اور جناب حمید اور جناب شہرت عظیم آبادی تشریف لائے اور ایک دو صاحبوں کے بعد ہمارے یک رنگ دوست جناب مولوی رضا علی وحشت نے غزلیں سنانی شروع کیں۔ ابتدا میں انھوں نے چند فارسی کی اور اردو کی رباعیاں سنائیں جن کا مزا کوئی آزاد ہی کے دل سے پوچھے، رباعیوں کے بعد انھوں نے اپنی فارسی کی غزل پڑھی، جس کا ہر شعر لاجواب اور لطفِ زبان میں ڈوبا ہوا ہے ؎

ارادتے کہ مرا با تو ہست میدانی — محبتیکہ ترا با من ست میدانم
مرا تو دوست شماری بروچہ میگوئی — کہ دوستی تو با دشمنست میدانم
بہ بزم او تپش دل بلا سبب نہ بود — نگاہِ برق سوئے خرمنست میدانم
ادائے او پئے فہمیدست می فہم — ہجلئے او پے دانستست میدانم

بہ وحشت ایں ہمہ لطفش بلا سبب نہ بود
ادائے تازہ دل بر و نست میدانم

مولانا آزاد نے اس غزل کا مطلع درج نہیں کیا، مطلع یہ ہے ؎

تو دوستی و فلک دشمن است می دانم
سعادتے کہ ز آن من ست، می دانم

اس غزل کے مزید تین اشعار ہیں جو "ترانۂ وحشت" میں شامل ہیں ـــــ ممکن ہے کہ

وحشت نے یہ اشعار بعد میں کہے ہوں۔ البتہ مندرجہ بالا پانچ اشعار میں سے تیسرا شعر وحشت نے "ترانۂ وحشت" میں شامل نہیں کیا ہے۔

اسی مقالے میں مولانا آزاد آگے رقمطراز ہیں :

"اس کے بعد انہوں نے (وحشت نے) اُردو کی دو غزلیں سنائیں، جن کے چار شعر یاد رہ گئے ہیں ؎

جانِ ان کی اداؤں پہ نکلتی ہی رہے گی　　یہ چھیڑ جو چلتی ہے تو چلتی ہی رہے گی

گرمیِ سوزشِ دل مرگ ہے ناچار نہیں
نالۂ مرغِ گرفتار، گرفتار نہیں،

حسن یہ تیرے کرشمے ہیں کہ با ایں ہمہ شوق　　طاقتِ دید نہیں قوتِ گفتار نہیں

چاہتے ہو کہ نہیں پھر کھاؤں فریبِ غمزہ
لب اقرار کہاں ہے اگر انکار نہیں

پھر طرح کی دو غزلیں سنائیں جو بہت ہی خوب اور زبان و مضمون دونوں کا لطف لیے ہوئے تھیں، اہلِ مجلس نے بھی خوب دل کھول کر داد دی۔ اور اس طرح ان کی غزل خوانی ختم ہوئی۔

ان کے (سید حسین سلیم لکھنوی کے) بعد (خاکسار) ابوالکلام آزاد کی باری تھی، جیسا کہ مشاعرے کا دستور ہے، میں نے بھی چند رباعیاں فارسی اور اردو کی لکھی تھیں، مگر غلطی سے وہ کاغذ ضائع ہو گیا۔ اور رباعیاں نہ سنا سکا۔ ایک رباعی اس وقت یاد آگئی ہے ناظرین کے مطالعے کے لیے پیش کرتا ہوں۔ اور فارسی کے چند شعر جو مشاعرے سے کچھ دیر پہلے لکھے تھے۔ اس کے بعد سنائے جن میں سے پانچ شعر یہ ہیں، آگے چل کر لکھتے ہیں :

اس کے بعد میں نے اپنی دوسری فارسی کی غزل (کمالت ایں خیالت ایں) کے چند اشعار پڑھے اور ان دونوں فارسی غزلوں پر تمام اہلِ مجلس نے بالعموم اور جناب شمس صاحب نے بالخصوص ذرہ نوازی کا ثبوت دیا، پھر ایک اردو غزل تازہ افکار کے چند شعر پڑھے، ملاحظہ ہو؎

ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے
یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے
یہ دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے

ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے
کچھ اور ہی سمجھے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے
بے خود بھی ہیں ہشیار بھی ہیں دیکھنے والے
ان مستِ نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے

آزاد ہوں اور گیسوئے پیچاں میں گرفتار
کہہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی جوہر نے کلکتہ سے ہفت روزہ "کامریڈ" کا اجرا کیا، مولانا جوہر بھی شاعر تھے، نصیر حسین خیال، نواب امداد اثر، نظم طباطبائی، مرزا محمود عسکری، قاضی عبدالحمید، عبدالغفور نساخ، مولانا آزاد اور مولانا وحشت جیسے اکابر ادب روزانہ شام کو "کامریڈ" کے دفتر میں جمع ہوا کرتے اور خوب دلچسپ صحبتیں رہتیں۔

علامہ شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی اور حسرت موہانی جیسی برگزیدہ شخصیتوں کی آمد سے کلکتہ کی ادبی محفلوں کی رونقیں دوبالا ہو جاتیں، ہر مجلس میں آزاد اور وحشت اہل کلکتہ کی جانب سے نمائندگی کرتے اور دونوں رفیق و جلیس رہتے، دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ ان دونوں ہم عصروں میں جو خلوص و محبت اور رسم و راہ تھی، اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی جب ملاقات کو کچھ دن گزر جاتے تو نظموں کی زبان میں محبت کا اظہار اور جذباتِ دل کی ترجمانی کی جاتی اور یہ تجدید ملاقات، تجدید محبت کی شکل اختیار کر جاتی، ذیل میں مولانا وحشت کی ایک فارسی نظم ہدیۂ قارئین کی جاتی ہے، جو ایک ایسے ہی موقع کی ایک لافانی یادگار ہے، کاش بے مروت خود غرض، زر پرست اور دل آزار زمانے میں پھر کوئی آزاد اور وحشت پیدا ہوں تاکہ مکر و فریب کی یہ فضا اخلاص و محبت کی خوشبوؤں سے معمور اور معطر ہو سکے، مولانا رضا علی وحشت کی یہ نظم "بر تجدید ملاقات بعد مدتِ مدید، محبی مولانا ابوالکلام آزاد" کے عنوان سے ترانۂ وحشت میں شائع ہوئی ہے ؎

بازبا آزاد کہ تجدید محبت کردہ ام	آنچہ دل از مدتے میخواست وحشت کردہ ام
بردہ ام تا آستان او جبین شوق را	از وفور آرزو سامان راحت کردہ ام،
گوش دل را از پیامش دادہ ام ذوق نشاط	کام جان را راز کلامش غرق لذت کردہ ام
گر لقائش دیدہ ام آئینۂ حق دیدہ ام	در ثنایش کردہ ام عرضِ حقیقت کردہ ام
مصرعِ خود می برد وحشت مرا از خویشتن	بازبا آزاد تجدید محبت کردہ ام

(ہفت روزہ چٹان، لاہور- ۲۰ اگست ۱۹۷۴ء)

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی

پنڈت جواہرلال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی رفاقت، جو بعد میں ذاتی دوستی میں تبدیل ہوگئی تھی ہندو مسلم اتحاد کی علامت اور ہندوستان کی تحریک آزادی کا روشن باب تھی اور حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کی تعمیر جدید میں اس نے بہت اہم اور مفید رول ادا کیا۔ ہماری تحریک آزادی کے دوران سیاسی رفاقت اور ایک اعلیٰ مقصد کے لیے مشترکہ جد و جہد بہت سے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لائی تھی اور اس نے ان کے درمیان زندگی بھر کے روابط کا سروسامان مہیا کیا تھا اور ایسا ہونا قدرتی تھا۔ لیکن پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے باہمی روابط کی نوعیت اور ان کی اہمیت کئی اعتبار سے دوسروں سے مختلف اور ممتاز تھی۔ ان دونوں کا خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت اور ماحول ایک دوسرے سے بالکل جدا تھا۔ پنڈت نہرو کے والد ماجد پنڈت موتی لال نہرو انڈو ویرانی تمدن کے بہترین نمایندے اور ایک روشن خیال انسان تھے ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور جواہر لال جی ان کے تنہا بیٹے تھے۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت یورپین امرا کے بیٹوں کے طرز پر ہوئی تھی اور انہیں کم عمری ہی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا تھا اس کے برخلاف مولانا آزاد کے والد ماجد مولانا خیرالدین ایک عالم دین اور خاندانی پیر تھے وہ اپنے عقائد و نظریات میں سخت قدامت پسند تھے اور انہوں نے مولانا آزاد کی تعلیم و تربیت اپنی ذاتی نگرانی میں گھر ہی پر کی تھی۔ جدید مغربی علوم تو علاحدہ رہے مولانا خیرالدین اسے بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کا بیٹا انگریزی زبان سے واقف ہو۔ پنڈت نہرو نے یورپ میں رہ کر جدید افکار و نظریات سے واقفیت حاصل کی اور مولانا آزاد درسِ نظامیہ کی تحصیل میں مشغول رہے، لیکن اپنی خداداد ذہانت کی بدولت وہ اپنے ماحول اور طرز تعلیم سے مطمئن نہیں تھے اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے دوسرے سرچشموں کا سراغ لگایا اور ان کے ذریعے ذہنی آسودگی حاصل کرنے

کی کوشش کی۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں مشرق اوسط کے بعض ممالک میں جانے کا موقع ملا، جہاں ان کی ملاقات بعض روشن خیال لوگوں سے ہوئی اور بعض عصری تحریکوں سے واقفیت حاصل ہو سکی۔ اس سے ان کی فکر میں گہرائی اور نظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ پھر بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ ان کا فکری اسلوب اور نقطۂ نظر ایک ایسے شخص سے ہم آہنگ ہوگا جس نے برسوں انگلستان کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔

مولانا آزاد نے ملکی سیاست میں پنڈت جواہرلال نہرو سے پہلے حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور اس ناتے ان کے دوستانہ مراسم پنڈت موتی لال نہرو سے قائم ہوگئے تھے۔ جب جواہرلال جی انگلستان سے واپس آئے تو مولانا آزاد کا شمار اپنی کم عمری کے باوجود کانگریس کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں ہونے لگا تھا جب کہ جواہر لال جی کی حیثیت صرف دور کے تماشائی کی تھی۔ مسٹر عبداللہ بٹ نے مولانا آزاد پر جو مجموعۂ مضامین ۱۹۴۳ء میں شائع کیا تھا اس میں پنڈت نہرو نے لکھا تھا :

"تقریباً ۲۲ سال ہوئے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی۔۔۔۔۔۔ عمر کے لحاظ سے ابھی ان کا عالم شباب تھا، لیکن ان کے چہرے پر پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے اور اس طرح ان کی جگہ بزرگانِ کانگریس کے درمیان ناگزیر تھی۔ چونکہ مجھے خود بھی اس وقت کانگریس کے اندرونی حلقوں سے آشنا گہرا ربط و ضبط نہیں تھا، اس لیے اس وقت انہیں صرف دور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا۔"

آہستہ آہستہ پنڈت نہرو بھی کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہونے لگے اور اس طرح مولانا آزاد سے ان کا ربط و ضبط بڑھنے لگا اور پھر وقت آیا کہ کانگریس کی مختلف مجالس میں دونوں نے برسہا برس دوش بدوش کام کیا۔ اسی مضمون میں پنڈت نہرو نے لکھا ہے :

"لیکن اس کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں مجھے ان کو بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے ان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے ایام قید و بند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانے کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگریس کے روزانہ مشاغل اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے

ان کی مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے۔"

اس رفاقت نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں بہت مدد دی اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بڑی گنجایش اور گہری انسیت پیدا ہوگئی۔ اس کی شہادت ایک دوسرے کے بارے میں دونوں کی متعدد تحریروں سے ملتی ہے۔ لیکن ایک بات ضرور محسوس ہوتی ہے، مولانا آزاد کا تعلق پنڈت نہرو سے زیادہ تر محبت و رأفت کا رہا جب کہ پنڈت جی، مولانا کی ہمیشہ عزت کرتے رہے۔ اس کا سبب دونوں کے مزاجوں میں تفاوت کے علاوہ غالباً یہ تھا کہ، جیسا کہ عرض کیا گیا کانگریس میں مولانا آزاد، پنڈت نہرو سے سینیئر تھے اور پنڈت جی سے پہلے ان کے تعلقات ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال نہرو سے استوار ہو چکے تھے۔ اس تعلق کو دونوں نے ہمیشہ ملحوظِ نظر رکھا اور کبھی ذہن سے محو نہیں ہونے دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے جس مضمون کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اس کے علاوہ پنڈت جی نے "تلاشِ ہند" میں بھی مولانا آزاد کا ذکر گہری عقیدت سے کیا ہے اور مولانا کی وفات کے بعد اپنی متعدد تقریروں میں ان کے بارے میں اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتے رہے۔ پنڈت نہرو کا ذکر مولانا آزاد نے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ "انڈیا ونس فریڈم" میں کیا ہے اس کے علاوہ "غبارِ خاطر" کے بعض خطوط میں بھی ان کے بارے میں بعض اشارے ملتے ہیں اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے پنڈت نہرو نے اپنے نام آنے ہوئے خطوط کا جو مجموعہ "کچھ پرانے خطوط" کے نام سے شائع کیا تھا اس میں مولانا آزاد کے بھی کئی خطوط شامل ہیں اور ان سے بھی پنڈت جی کے بارے میں مولانا کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان سب تحریروں کے مطالعہ سے ایک بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ مختلف قومی معاملات میں عقائد و نظریات کی جو ہم آہنگی ان دونوں کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کانگریس ہائی کمانڈ کے کسی اور رکن کے ساتھ نہیں تھی۔ دونوں کے ذہنی پس منظر کا جو اختلاف مضمون کے شروع میں بیان کیا گیا اس کے پیش نظر یہ بہت بڑی بات تھی اور ظاہر ہے کہ اس کا کریڈٹ پنڈت نہرو سے زیادہ مولانا آزاد کو جاتا ہے۔

پنڈت نہرو، مولانا آزاد کی علمیت اور ذہانت سے بہت متاثر تھے، اس کا اظہار انھوں نے اپنی تقریباً ہر تحریر اور تقریر میں بڑے احترام اور استعجاب سے کیا ہے

اور انہیں فرانس کے قاموسیوں سے تشبیہہ دی ہے۔ "ابو الکلام آزاد" مرتبہ عبداللہ بٹ میں تحریر فرماتے ہیں:

"حق یہ ہے کہ ان کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی۔ ...... مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آجاتے ہیں جو انقلاب فرانس سے کچھ عرصہ پہلے وہاں موجود تھے تاریخ اقوام ماضیہ میں ان کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور پھر یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود تھا ان کا ذہن مدلل اور سلجھا ہوا ہے ...... ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز ہے ...... جو زبان وہ لکھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ پر معنی الفاظ سے مملو ہوتی ہے۔"

"تلاشِ ہند" کے پیش لفظ میں انہوں نے مولانا آزاد کی علمیت کو اس طرح خراجِ تحسین ادا کیا ہے:

"ان کے وسیع علمیت نے مجھے ہمیشہ مسرت بخشی ہے، لیکن کبھی کبھی مبہوت بھی کیا ہے۔"

کتاب میں "الہلال" کے اجرا کے زیرِ عنوان مولانا آزاد اور ان کی علمی و سیاسی خدمات پر طویل تحریر شامل ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"الہلال" ابو الکلام آزاد نے جاری کیا تھا (جو آج کل کانگریس کے صدر ہیں) وہ ایک چوبیس سالہ ذہین نوجوان تھے ...... وہ ابھی ۲۰ سال سے کم عمر ہی کے تھے کہ اپنی عربی اور فارسی کی قابلیت اور گہری علمیت کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے تھے اس میں انہوں نے ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا اور وہاں کی اصلاحی تحریکوں نیز یورپ میں پیش آنے والے واقعات سے اپنی واقفیت کا اضافہ کیا۔ ان کا طرزِ فکر عقلیت پسندانہ تھا اور ساتھ ہی وہ اسلامی علوم اور تاریخ کا گہرا علم رکھتے تھے اس لیے انہوں نے قرآن کی تفسیر عقلی رنگ میں لکھی ...... اپنی تصانیف کی وجہ سے وہ اسلامی ملکوں میں غالباً کسی بھی دوسرے ہندوستانی مسلمان سے زیادہ معروف تھے ...... ان کا طرزِ فکر معتمر مسلمان رہنماؤں سے مختلف تھا اور ان کا زاویۂ نظر زیادہ وسیع اور زیادہ مبنی بر عقل تھا جس کی بدولت وہ ان معتبر رہنماؤں کے جاگیر دارانہ تصورات، ان کی مذہبی تنگ نظری اور علاحدگی پسندانہ رجحانات سے دور رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہندوستانی

قومیت کے حامی بن گئے ...... ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفت روزہ "الہلال" میں ان (مسلمانوں) سے ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ صرف ان کے خیالات اور نقطۂ نظر ہی میں ندرت نہیں تھی بلکہ ان کا اسلوبِ نگارش بھی نیا تھا۔ آزاد کا اسلوب جاندار اور پرجوش تھا، البتہ اپنے فارسی پس منظر کی وجہ سے کسی قدر دقیق ضرور تھا۔ انہوں نے نئے خیالات کے لیے نئی ترکیبیں تراشیں اور اردو زبان کی موجودہ تشکیل میں ان کا اثر واضح طور پر نمایاں ہے ..... ان (معمر رہنماؤں) میں بڑے سے بڑا عالم بھی مذہبی بحثوں میں آزاد پر آسانی سے سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ آزاد کا قرآن اور حدیث کا علم ان سے زیادہ تھا۔ وہ عہد وسطیٰ کے متکلمانہ خیالات، اٹھارھویں صدی کی عقلیت پسندی اور عہد حاضر کے علمی رجحانات کا ایک عجیب مجموعہ تھے۔"

مولانا آزاد کے انتقال پر لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے ان کی عالمانہ شان، ذہنی رفعت اور انسانی عظمت کے بارے میں کہا تھا:

"میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں آیندہ کوئی بڑا آدمی نہیں پیدا ہوگا۔ ہمارے یہاں بڑے آدمی ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ مخصوص قسم کی عظمت جس کے نمایندے مولانا آزاد تھے، آیندہ ہندوستان میں یا کسی بھی دوسری جگہ اس کے وجود میں آنے کا امکان نہیں ہے۔ مجھے ان کی ان متعدد خصوصیات کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔ یعنی ان کی گہری علمیت، ان کا عالمانہ مرتبہ اور ان کی عظیم خطابت۔ وہ ایک عظیم مصنف تھے اور کئی اعتبار سے عظیم تھے لیکن دوسرے عالم بھی ہیں، دوسرے خطیب بھی ہیں۔ مولانا آزاد ماضی اور حال کی عظمت کا مجموعہ تھے، وہ مجھے ہمیشہ ان سیکڑوں سال پرانے عظیم انسانوں کی یاد دلاتے تھے جن کا ذکر میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے اور ان ہی کی نمایندگی کرتے تھے۔ اگر میں یوروپ کی تاریخ کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے نشاۃ ثانیہ کے عظیم انسان یا بعد کے دور میں انقلاب فرانس سے پہلے کے قاموسی یاد آجاتے ہیں جو (بیک وقت) دانش ور اور عملی انسان تھے ......

اس طرح یہ ماضی کے اوصافِ حمیدہ ــــ وقار، گہری علمیت اور فراخ دلی اور حال کے تقاضوں کا عجیب اور بے مثال مجموعہ تھا، جس نے مولانا آزاد کو وہ بنا دیا جو وہ تھے۔ وہ

اس مشترک تمدن کے بلند پایہ اور مخصوص نمایندے تھے جو ہندوستان میں آہستہ آہستہ بڑھا اور پھیلا ...... اس طور پر آج ہم ایک عظیم انسان کے گزر جانے کا ماتم کر رہے ہیں، ایک ایسا انسان جو درخشندہ ذہانت اور طاقت ور ذہن کا مالک تھا اور جس میں کسی بھی مسئلے کی تہہ تک پہنچ جانے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ میں نے لفظ درخشندہ استعمال کیا ہے میرا خیال ہے کہ شاید یہ بہترین لفظ ہے جو میں ان کے دماغ کے لیے استعمال کر سکتا ہوں ــــ ایک درخشندہ دماغ۔ جب ہم ایک ایسے ساتھی، دوست، رفیق، کامریڈ، لیڈر اور استاد ــــ آپ انہیں جو بھی چاہیں کہہ سکتے ہیں ــــ کو کھو دیتے ہیں اور اس سے جدا ہو جاتے ہیں تو لازمی طور پر ہماری زندگی اور مشاغل میں زبردست خلا پیدا ہو جاتا ہے۔"

پنڈت نہرو نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں مولانا آزاد کی سیاسی خدمات کا ذکر بھی خلوص و احترام کے ساتھ کیا ہے اور ان کی اصابت رائے کی سراہنا کی ہے۔ "ابوالکلام آزاد" مرتبہ عبداللہ بٹ میں لکھا ہے:

"کانگریس کی تاریخ میں اور بنا بریں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگریس کی تجاویز و عزائم کی تراش خراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست ہاتھ کس طرح مصروف کار رہا ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ وہ پریزیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر، ان کے آرا اور مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے تھے، کیونکہ ان راؤں اور مشوروں کے پس پردہ دانش و تدبر اور فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی ...... وہ ہمارے لیے اور ملک و قوم کے لیے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ رہے ہیں۔ قطعِ نظر اس سے کہ ہم نے ان کی رائے سے اختلاف کیا یا اتفاق، ہم ہمیشہ یہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں کہ ان کی رائے بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہو اور یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں۔"

"تلاش ہند" میں تحریر فرماتے ہیں:

"تقریباً ۴ سال تک نظر بند رہنے کے بعد جب وہ (۱۹۲۰ء میں) قید سے رہا ہوئے

تو انہیں نیشنل کانگریس کے لیڈروں کی صف میں جگہ ملی اور تب سے وہ برابر کانگریس کی سب سے بڑی مجلس عاملہ کے رکن ہیں اور اپنی کم عمری کے باوجود کانگریس کے اکابر میں شمار کیے جاتے ہیں ان کی رائے قومی اور سیاسی امور میں اور فرقہ وارانہ اور اقلیتوں سے متعلق مسائل میں بہت وقیع سمجھی جاتی ہے۔ وہ دو مرتبہ کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں اور بار بار قید کی سختیاں جھیل چکے ہیں۔"

"غبارِ خاطر" چونکہ نجی خطوط کا مجموعہ ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے اس میں مولانا آزاد نے اپنے قلعۂ احمد نگر کے دو، تین ساتھیوں ہی کا ذکر کیا ہے اور یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ سیاست کے علاوہ مولانا کے ذوق کے کچھ اور رشتے بھی مشترک تھے۔ صرف ایک خط ایسا ہے جس میں آصف علی صاحب اور ڈاکٹر سید محمود کا ذکر ملتا ہے البتہ پنڈت نہرو کا ذکر مولانا نے کئی خطوط میں فرمایا ہے اور وہ بھی مختلف عنوانوں سے، کہیں ان کے نیند میں خراٹے لینے اور انگریزی میں بڑبڑانے کا ذکر کیا ہے اور اس سے ان کی طبیعت کی جذباتیت کا سراغ لگایا ہے، کہیں ان کے مٹھاس کے شوق اور گڑ سے رغبت کی نشاندہی کی ہے، کہیں ان کے "خواص یوروپ کی ہم مشربی کے ذوق میں" بغیر دودھ کی چائے پینے لیکن "اپنی پیچو پیچو ہی کی قسموں پر قانع" رہنے پر پھبتی کسی ہے، کہیں ان کے "جوہر مستعدی" کی داد دی ہے، جس کا مظاہرہ انہوں نے ذوقِ باغبانی کی صورت میں کیا تھا۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی پنڈت جی اور مولانا کے باہمی رشتۂ موانست سے آگاہ تھے۔

چنانچہ جب مولانا کی بیگم کلکتہ میں علیل ہوئیں اور حکومت نے چاہا کہ مولانا خواہش کریں تو حکومت انہیں بیگم صاحبہ کی تیمار داری کے لیے عارضی طور پر رہا کر دے، لیکن مولانا ایسی کوئی درخواست کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے، تو جیل کا سپرنٹنڈنٹ پنڈت نہرو ہی کے پاس گیا کہ وہ مولانا کو اس پر راضی کریں اور پنڈت جی نے اس سلسلے میں ان سے گفتگو بھی کی، اگرچہ ان کی خودداری غیر ملکی حکومت کے بارِ احسان کی متحمل نہ ہو سکی۔

"کچھ پرانے خطوط" میں مولانا آزاد کے جو مکاتیب شامل ہیں ان سے ذاتی روابط پر بھی روشنی پڑتی ہے اور بعض سیاسی مسائل سے متعلق طرزِ فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں

میں مولانا کو الٰہ آباد میں کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ وہاں پنڈت نہرو نے ان کی جس طرح تیمار داری اور دیکھ بھال کی اس پر جذباتِ تشکر و امتنان کا اظہار فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"جب میں اپنے الٰہ آباد والے سانحے پر غور کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اگر یہ سانحہ کلکتہ میں پیش آیا ہوتا تو میرے یہاں کے اپنے عزیز بھی میرے آرام و آسایش اور علاج معالجے کے سلسلے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے جو الٰہ آباد میں کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میرے عزیز ترین رشتے دار بھی میرے لیے اس سے زیادہ دردمند ثابت ہوتے جتنے تم میرے لیے الٰہ آباد میں تھے .... الٰہ آباد سے واپس آتے وقت تم نے میری راحت و آسایش کی چھوٹی سے چھوٹی جزوی باتوں کا بھی لحاظ رکھا اور یہ اہتمام صرف ایک شب کے سفر کے لیے کیا۔"

اس سے جہاں پنڈت نہرو کے مولانا آزاد کے ساتھ تعلقِ خاطر کا پتا چلتا ہے، وہاں ان کی فطری مہمان نوازی اور حسنِ انتظام کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔

۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد نے رام گڑھ کانگریس کی صدارت کی تھی۔ ان کے خطبۂ صدارت کا انگریزی ترجمہ پنڈت نہرو نے کیا تھا۔ اپنے ایک خط میں مولانا نے ان کی ترجمے کی مہارت اور انگریزی دانی کی داد اپنے مزاج کے خلاف بڑے پُرجوش انداز میں دی ہے اور ساتھ ہی ترجمے کے فن اور اس کی باریکیوں پر بہت پُرمغز تبصرہ فرمایا ہے، اس خط سے مولانا آزاد کی انگریزی دانی پر بھی کچھ کم روشنی نہیں پڑتی ہے۔ اسی سال گرمیوں میں مولانا آزاد کچھ عرصہ کے لیے کسی پہاڑ پر قیام فرمانا چاہتے تھے، چنانچہ ایک خط میں پنڈت نہرو سے نہایت بے تکلفی سے فرمایش کی ہے کہ اگر ان کے جاننے والوں میں مسوری میں کوئی صاحب ایسے ہوں جو مکان کا انتظام کر سکیں ـــ خواہ کرائے پر یا بغیر کرائے کے ـــ تو یہ انتظام کرا دیا جائے۔ جو لوگ مولانا کے مزاج سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولانا یہ فرمایش کسی ایسے ہی شخص سے کر سکتے تھے جس سے ان کی غیر معمولی بے تکلفی ہوتی اور جو ان سے بہت قریب ہوتا۔ ایک دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو نے ان کے قیامِ مسوری کا انتظام کر دیا تھا لیکن اس دوران میں وہ نینی تال

تشریف لے گئے اور اس لیے مسوری جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس خط میں انہوں نے خود پنڈت نہرو کو نینی تال آنے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی ہے۔ ۱۹۴۲ء کے ایک خط میں پنڈت جی کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کی طرف اس طرح متوجہ کیا ہے:

"تم کولو میں جتنے زیادہ دن ٹھہرو گے مجھے اتنی ہی زیادہ مسرت ہوگی۔ الہ آباد میں تمہیں پژمردہ اور دل گرفتہ دیکھ کر مجھے بڑی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اب یہ بات مان لینی چاہیے کہ تم پچاس سال پورے کر کے آگے بڑھ رہے ہو اور تمہیں اپنی صحت کی کسی قدر زیادہ فکر رکھنی چاہیے۔"

جن خطوط میں سیاسی مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور اہم ۱۹۴۰ء کے وہ دو خط ہیں جو دوسری جنگِ عظیم سے متعلق کانگریس اور بعض کانگریسی رہنماؤں کے رویے کے بارے میں مولانا آزاد کے طرزِ فکر کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلے خط میں مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس معاملے میں ہمارے اور تمہارے خیالات ایک ہی ہیں اور یہ دیکھ کر بڑی تسکین ہوتی ہے کہ گاندھی جی بھی اس سے پورے طور پر متفق ہیں۔ راجن بابو کے بیان کے مقابلے میں آصف علی کا بیان اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض تھا۔ ... ڈو باتیں تم نے ایسی لکھی ہیں جن سے میں اتفاق نہیں کرتا ..... تم راجن بابو کے خط میں کہتے ہو کہ "ستیہ گرہ کی کوئی فوری ضرورت نہیں معلوم ہوتی خواہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ اس خاص موقع پر جب کہ برطانیہ خطرے میں ہے ہمارے لیے درست نہیں ہوگا کہ ہم اس کی مصیبت سے فائدہ اٹھائیں اور اس پر جھپٹ پڑیں۔" تم نے یہ خیال اپنی لکھنؤ کی تقریر میں بھی ظاہر کیا ہے اور پانیر نے تمہارے اصل الفاظ نقل کر دینے ضروری سمجھے: "یہ بات ہندوستان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ انگلینڈ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ستیہ گرہ شروع کر دے"۔ میں اس طرزِ فکر کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ..... میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کی وہ "شان" کیا ہے ..... ہم نے برطانیہ کو پورا موقع دیا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ رکھے مگر اس نے سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم مجبور کر دیے گئے کہ ہم اس کی شہنشاہیت پرستی کی جنگ میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ

کریں۔ اگر ہمارا موجودہ موقف ایسا ہے جو (بقول گاندھی جی کے) اس کو "پریشان کرتا ہے"، یا بقول تمہارے ہندوستان کی "شان" کے خلاف ہے تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں، اس کی ذمہ داری برطانوی حکومت کے ناعاقبت اندیشانہ تکبر پر عائد ہوتی ہے .... اپنے اسی خط میں آگے چل کر حکومت کے ساتھ معاہدہ ہو جانے کی صورت میں ہمارے آئندہ رویے کے بارے میں بھی تم نے کچھ لکھا ہے۔ تمہارا کہنا ہے: "یہ تمام باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں (یعنی آزادی، حق خود ارادیت اور بالغ حق رائے دہی کے ساتھ نمایندہ اسمبلی کی تشکیل) تب بھی ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی اصلی قوت و طاقت جنگ میں جھونک دیں گے"۔ لیکن اگر یہ لازم نہیں آتا تو ہم یہ امید کیوں رکھیں کہ ہم جو کچھ مانگتے ہیں برطانوی حکومت ہمیں دے دے گی؟ ..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کے پراگندہ اور غیر منطقیانہ تخیل نے تمہارے دماغ تک کیوں کر راہ پائی؟"

دوسرے خط میں اپنے موقف کی تشریح اس طرح کی ہے:

"از راہِ کرم میرا بیان پھر پڑھو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ قرارداد بہ اتفاقِ رائے منظور ہوئی۔ میں نے صرف قرارداد کے ذہنی پہلو کی توجیہہ کی ہے اور یہ کہا ہے کہ ہر شخص کا ذہن و دماغ اس بارے میں صاف تھا کہ اگر ہندوستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو اسے (ہندوستان کو) جنگ میں شریک ہو جانا چاہیے"۔

دراصل جنگی مساعی میں ہندوستان کی شرکت یا عدم شرکت کے بارے میں کانگریسی رہنماؤں کے درمیان شدید اختلافِ رائے تھا۔ گاندھی جی کا موقف برابر تبدیل ہوتا رہا۔ ہائی کمانڈ میں جو لوگ گاندھی جی کے مکمل پیرو تھے ان کا عام رویہ یہ تھا کہ چوں کہ جنگ میں شرکت عدم تشدد کے اصول کے خلاف ہے اس لیے ہندوستان کو اس سے باز رہنا چاہیے۔ اس کے برخلاف پنڈت نہرو اپنی جمہوریت دوستی اور فسطائیت دشمنی کے سبب اتحادی طاقتوں کے حامی تھے۔ لیکن مولانا آزاد کا کہنا تھا کہ اگر برطانوی حکومت جنگ کے دوران میں ہندوستان کو اندرونی خود مختاری اور جنگ کے بعد مکمل آزادی دینے کے لیے تیار ہو تو ہندوستان کو جنگی مساعی میں بھرپور حصہ لینا چاہیے ورنہ

نہیں۔ بالآخر جنگ کے فیصلہ کن مراحل تک پہنچتے پہنچتے گاندھی جی اور ہائی کمانڈ کے دوسرے اراکین بھی اسی موقف کے حامی ہو گئے اور یہی کانگریس کی سرکاری پالیسی قرار پائی۔ اس مسئلے پر مولانا آزاد نے "انڈیا ونس فریڈم" میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے۔ کہ ورکنگ کمیٹی میں مباحث کے دوران اکثر و بیشتر ان کا اور پنڈت نہرو کا نقطۂ نظر ہم آہنگ ہوتا تھا جب کہ دوسرے لوگ اس سے اختلاف کرتے تھے۔

"انڈیا ونس فریڈم" میں مولانا آزاد نے جن سیاسی شخصیتوں کے افکار و اعمال سے بحث کی ہے اس میں تنہا نہرو ہی ہیں، جو اس تنقید کی گرفت سے آزاد رہے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے پنڈت نہرو کی شخصیت کا جو نقش پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے وہ ایک مخلص، حق پسند، نڈر، انسانیت دوست، محبِ وطن، ذی شعور لیکن کسی قدر جذباتی، تخیل پسند اور جلدباز انسان کا نقش ہے۔ کتاب کا انتساب مولانا نے پنڈت جی ہی کے نام کیا ہے اور یہ بجائے خود ان کے پنڈت جی کے ساتھ تعلق خاطر کی بہت بڑی شہادت ہے۔ سیاسی زندگی کے نشیب و فراز میں دونوں زیادہ تر ہم قدم اور ہم زبان رہے اور بالخصوص انتقال اختیارات کے فیصلہ کن مراحل پر ملک میں جو اتھل پتھل ہوئی اس میں تو یہ ہم خیالی اور زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس نے مظلوم و درماندہ انسانوں کے حق میں بڑی مسیحائی کی۔ جن معاملات میں اختلاف رائے بھی ہوا، مثلاً ۱۹۳۷ء میں یو۔ پی کی کانگریسی وزارت میں مسلم لیگی نمائندوں کی شرکت یا عدم شرکت کا مسئلہ یا کیبنٹ مشن کی تجاویز کی تعبیر و تشریح کا مسئلہ وہ بھی اسی حد تک محدود رہا اور ذاتی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔ البتہ تقسیم ہند کا مسئلہ ایسا تھا جس کے بارے میں مولانا آزاد کے جذبات بہت شدید تھے اور وہ اسے ماننے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھے۔ جیسے جیسے ان کے سیاسی رفقا، اس کے حامی ہوتے گئے۔ ویسے ویسے مولانا کو ان سے شکایت پیدا ہوتی گئی اور ان میں پنڈت نہرو بھی شامل تھے "انڈیا ونس فریڈم" میں صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں مولانا آزاد نے شخصی سطح پر پنڈت نہرو کے رویے پر اظہار ملال کیا ہے۔ جب ۱۹۴۶ء میں مولانا آزاد کی کوششوں سے پنجاب میں کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کی ملی جلی وزارت قائم ہو گئی اور مسلم لیگ حصول اقتدار میں ناکام رہی تو پنڈت نہرو نے اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ کیونکہ پنڈت جی یونینسٹ پارٹی

کو اصولاً اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کو ترجیح دیتے تھے۔ مولانا آزاد کو خیال ہوا کہ پنڈت جی کی اس ناپسندیدگی میں بعض لوگوں کی ریشہ دوانیوں کا ہاتھ تھا جو کانگریس اور ملک میں مولانا کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے پنڈت جی کو مشکوک کرنا چاہتے تھے۔ اس واقعے کے ذکر سے پہلے مولانا نے پنڈت جی کے ساتھ اپنے خوشگوار تعلقات اور سیاسی مسائل میں ہم خیالی کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

"شروع ہی سے، جب کانگریس میری سرگرمیوں کا مرکز بنی، میں اور جواہر لال بہترین دوست تھے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی تائید پر بھروسہ کرتے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان رقابت یا حسد کا سوال کبھی نہیں پیدا ہوا اور میرا خیال تھا کہ ایسا کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہرو خاندان سے میرے تعلقات کی تاریخ پنڈت موتی لال نہرو کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے بھی میں جواہر لال کو ایک بھائی کے بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور وہ بھی اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے میرا احترام کرتے رہے"

اور پھر لکھا ہے:

"جواہر لال طبعاً پُر تپاک قلب اور فیاض طبیعت کے مالک ہیں۔ ذاتی رشک و رقابت کا خیال ان کے دماغ میں کبھی نہیں پیدا ہوا۔ لیکن بہرحال ان کے خاندان اور حلقۂ احباب میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو میرے ساتھ ان کے گرم جوشانہ تعلقات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور اس بات کے درپے رہتے تھے کہ ہم دونوں کے درمیان رشک و رقابت کی خلیج پیدا کر دیں۔ جواہر لال میں ایک کمزوری بھی ہے، وہ تخیل پسند آدمی ہیں۔ ان لوگوں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور انہیں میرے خلاف کر دیا۔ . . . جو لوگ میرے اور جواہر لال کے درمیان اختلاف پیدا کرنا چاہتے تھے، انہوں نے جواہر لال کو یہ بھی یاد دلایا کہ اس کارنامے پر میری جو تعریف و تحسین ہوتی ہے اس سے کانگریس کے دوسرے لیڈروں کا بھی متاثر ہونا لازمی ہے . . . . . . (اس کا) نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت جلد میں ایسی پوزیشن حاصل کر لوں گا کہ کانگریس میں میرا کوئی حریف باقی نہ رہ جائے گا اور یہ بات خود کانگریس کی جمہوری روایات کے خلاف ہوگی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ذاتی تاثرات

جواہرلال کے دل و دماغ کو متاثر کرسکے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ وہ فطریاتی طور پر ان خیالات سے متاثر ہوئے۔ بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو، بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے وقت، جب سے ہم دونوں نے کانگریس میں ایک ساتھ کام کرنا شروع کیا تھا، میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ ہر معاملے میں وہ میری مخالفت کررہے ہیں۔ انھوں نے برملا یہ بھی کہا کہ "میں نے پنجاب میں جو پالیسی اختیار کی وہ غلط تھی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ میں نے کانگریس کا وقار خاک میں ملا دیا۔ یہ باتیں سن کر میں متعجب ہوا اور ملول بھی۔"

لیکن یہ اختلاف بھی محض عارضی تھا اور پنڈت نہرو کی حساس اور فیاض طبیعت مولانا آزاد جیسے قدیم رفیق اور قریبی دوست کا ملالِ طبع زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ چنانچہ مولانا رقم طراز ہیں:

"ہوسکتا ہے کہ جواہرلال نے محسوس کیا ہو کہ یہ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے اور میرے جذبات کو اس گفت گو سے صدمہ پہنچا ہے ...... دوسرے دن صبح سویرے وہ میرے پاس آئے اور بڑی محبت اور اخلاص کے ساتھ مجھے یقین دلایا کہ ان کی نکتہ چینی ایک لمحے کے لیے بھی میری قیادت سے برگشتگی کا نتیجہ نہیں تھی۔ انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ اعتراف کیا کہ ان کی رائے غلط تھی اور خواہش ظاہر کی کہ اب ہم یہ باتیں فراموش کردیں مجھے جواہرلال سے یہی توقع تھی ..... میں اس صاف گفت گو سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اور میں ہمیشہ گہرے دوست رہے تھے اور اس بات سے مجھے تکلیف پہنچتی تھی کہ ہم دونوں کے درمیان کسی طرح کا بھی اختلاف ہو۔"

مولانا آزاد کو پنڈت نہرو کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا اور وہ انہیں ملک کے سیاسی اسٹیج پر جس طرح آگے بڑھانا چاہتے تھے اور اسے ملک کے لیے جتنا ضروری اور مفید سمجھتے تھے اس کا اندازہ ایک دوسرے واقعے سے ہوتا ہے۔ خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

"اب (۱۹۴۶ء میں) کہ حالات معمول پر آچکے تھے تدریجی طور پر یہ (کانگریس کے) نئے صدر کے انتخاب کا سوال پھر اٹھا۔ عام مطالبہ یہ تھا کہ مجھ ہی کو دوبارہ صدر منتخب ہونا چاہیے ..... کانگریسی اصحاب کا بھی عام رجحان یہی تھا ..... میں نے محسوس

کیا کہ کانگریس ہائی کمانڈ کے اندرونی حلقوں میں میرا انتخاب ایک اختلافی مسئلہ ہے کیوں کہ سردار پٹیل اور ان کے رفقاء چاہتے تھے کہ سردار پٹیل کو صدر منتخب ہونا چاہیے میں نے اس مسئلہ پر احتیاط کے ساتھ غور کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے دست بردار ہو جانا چاہیے ...... دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ میرا جانشین کون ہو ..... تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جواہرلال سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ۲۶ اپریل کو میں نے اس مفہوم کا بیان شائع کیا اور کانگریسی اصحاب سے اپیل کی کہ وہ بالاتفاق جواہرلال کو منتخب کرلیں۔ گاندھی جی سردار پٹیل کی طرف مائل تھے۔ لیکن جب جواہرلال کا نام میری طرف سے پیش ہوگیا تو پھر انھوں نے پبلک طور پر اس سلسلے میں اپنے خیالات ظاہر نہیں کیے۔"

پنڈت نہرو کو عارضی حکومت میں وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کا نائب صدر اسی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اس وقت کانگریس کے صدر تھے اور پھر ان کی یہی حیثیت حصول آزادی کے بعد ان کے وزیر اعظم بننے میں معاون ہوئی۔ مولانا آزاد کی عارضی حکومت میں شرکت محض گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے اصرار کی مرہونِ منت تھی ورنہ وہ خود اس کے حق میں نہیں تھے اور شروع میں عارضی حکومت میں شریک ہوئے بھی نہیں تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک صرف اس لیے حکومت ہند سے وابستہ رہے کہ پنڈت نہرو وزیرِ اعظم تھے اور انہیں کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا آزاد کی وفات کے بعد ایک صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کسی سلسلے میں مولانا کا یہ مقولہ نقل کیا کہ "پہلے ہم انگریز کے قیدی تھے۔ اب جواہرلال کے قیدی ہیں" خیر انگریز کی قید تو قیدِ ستم تھی لیکن جواہرلال جی کی جس قیدِ محبت کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا تھا اس کی لذت کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس راہ کے لذت آشنا ہوں۔

"انڈیا ونس فریڈم" گاندھی جی کے حادثہ قتل تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے بعد مولانا دس برس زندہ رہے۔ افسوس ہے کہ "انڈیا ونس فریڈم" کی تیسری جلد جس میں مولانا ان برسوں کی روداد حیات لکھوانے والے تھے، ان کے دماغ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں ہوسکی۔ نہ پنڈت نہرو نے اپنی کوئی ایسی یادداشت چھوڑی جس سے زمانے

کے حالات منصۂ شہود پر آسکتے ورنہ معلوم ہوتا کہ ہندوستان کی تعمیر جدید میں ان دونوں کے درمیان کیسی رفاقت رہی اور اس رفاقت نے ہندوستان کے عوام کے آرام و آسایش، ذہنی آسودگی، روحانی بالیدگی اور مادی ترقی و خوش حالی کی راہ میں کن سنگ ہائے گراں پر قابو پایا اور کتنے عظیم کارنامے انجام دیے۔ تاہم اخباری خبروں اور دوسرے ذرائع سے اتنا تو معلوم ہی ہے کہ حکومت اور جماعت دونوں میں جو ذہنی ہم آہنگی ان دونوں کے درمیان رہی اور دونوں ایک دوسرے کے لیے طاقت اور روشنی کا جیسا مینارہ بنے رہے اس میں کوئی تیسرا ان کا شریک و سہیم نہیں تھا۔ ہماری ریاست کا سیکولر کردار اور کانگریس کا جمہوری سوشلزم پر اعتقاد سب سے زیادہ ان دونوں کی رفاقت اور تعاون ہی کا مرہونِ منت ہے۔ مولانا بہت نازک مزاج اور خود دار آدمی تھے پنڈت جی نے ان کی نازک مزاجی اور خود داری کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔ جب تک مولانا زندہ رہے، پنڈت جی سب سے زیادہ ان ہی کے مشورے اور ہدایت پر اعتماد کرتے رہے اور جب ان کی وفات ہوگئی تو پنڈت جی کی تنہائی کے لیے کوئی دوسرا سہارا باقی نہیں رہا۔ جو لوگ ۱۹ سے ۲۱ فروری ۱۹۵۸ء تک دہلی میں موجود تھے وہ جانتے ہیں کہ مولانا آزاد کے مرض الموت کا یہ وقفہ پنڈت نہرو نے کسی ذہنی اذیت اور بے چینی میں گزارا اور مولانا کی وفات کا جو ماتم انھوں نے کیا وہ اس سے مختلف نہیں تھا جو ایک غم زدہ بھائی اپنے کسی بہت عزیز اور محبوب بھائی کی موت کا کر سکتا ہے اس موقع پر پنڈت نہرو کی شخصیت کا جو پہلو نظروں کے سامنے آیا اس نے بہت سوں کے نزدیک خود پنڈت جی کی محبوبیت میں بدرجہا اضافہ کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو ہماری قومی زندگی کے آفتاب و ماہتاب تھے، جب تک زندہ رہے اپنے کردار و شخصیت کی ضیا پاشیوں سے ہماری راہوں کو منور کرتے رہے اور اب کہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، ان کی مثال اور ان کے کارنامے ہمارے لیے روشنی، حرکت اور حیات کا سرچشمہ ہیں۔

- - - - - - - - - - - - - -

نہرو اور آزاد قلعہ احمد نگر میں

محمد عتیق صدیقی

محمد عتیق صدیقی مرحوم نے قلعۂ احمد نگر کی زندگی اور اس کے شب و روز کے بارے میں جو تفصیلات اس مضمون میں بیان فرمائیں تھیں وہ اگرچہ نہایت دل چسپ تھیں لیکن اس وجہ سے کہ وہ ایک دوسرے مضمون میں آچکی تھیں، نیز پنڈت جی سے براہِ راست ان کا تعلق نہ تھا اس لیے ان کی تحذیف مناسب معلوم ہوئی۔ اب یہ مضمون مکمل نہیں، بلکہ اس کا خلاصہ ہے۔

ابو سلمان شاہجہان پوری

کتنی کشش، کتنی دلفریبی ہے احمد نگر کے نام میں! کتنی یادیں ——— قدیم و جدید تاریخ کی ——— احمد نگر سے وابستہ ہیں۔ یہی وہ قلعہ ہے "جس کی سنگی دیواروں پر" مولانا آزاد کے الفاظ میں "برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں"، احمد نگر کا یہی قلعہ ہندوستان کے معرکۂ آزادی کے جرنیلوں کا آخری پڑاؤ بھی تھا" ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک" ایک چھوٹے سے قافلے کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ قافلہ سالار انڈین نیشنل کانگریس کے صدر مولانا آزاد تھے اور ان کے پیچھے جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، اچاریہ کرپلانی، آصف علی، گووند بلبھ پنت، شنکر راؤ دیو، ڈاکٹر پٹابھی ستیا رامیہ، پرفلا چندر گھوش، اچاریہ نریندر دیو، اور ڈاکٹر سید محمود تھے۔ یہ قافلہ کیونکر احمد نگر پہنچا؟ اس کا جواب بھی مولانا آزاد ہی کی زبان سے سنیے:

"۴ اگست کو بمبئی پہنچا تو انفلوئنزا کی حرارت اور سرگرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا...... ۴ سے ۷ اگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے۔ ۷ کی دوپہر سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے

تین دن کا انتظام بھی کیا تھا لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے بڑھنے نہ پائے۔ ۸ تاریخ کو دو بجے سے رات کے گیارہ بجے تک بیٹھنا پڑا لیکن کارروائی ختم کرکے اُٹھا

کام تھے عشق میں بہت، پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پہنچا تو صاحبِ مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا...... کہنے لگے...... گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئے گا۔ دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں...... میں نے جھنجھلا کر کہا...... اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت کیوں خراب کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجیے کہ آدھی رات جو باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے اور چند گھنٹے آرام کر لوں۔

"...... حسبِ معمول چار بجے اُٹھا لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرن کی دو گولیاں منہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوں کا مسودہ لکھ لوں۔ جو رات کی تجویز کے ساتھ پریزیڈنٹ روز ویلٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا...... کچھ تو جن اسپرن کی گولیوں نے کام کیا ہوگا۔ کچھ نسیم صبح گاہی کے شفابخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سر گرانی کم ہو رہی ہے۔ پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی کیفیت طاری کر دی:

نسیم صبح، تیری مہربانی!

"بے اختیار قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک...... کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں، دھیرو[۵۲] ایک کاغذ

---

[۵۱] - بھولا بھائی ڈیسائی (متوفی ۴۶ء) در دیکھیے "انڈیا ونس فریڈم"، از مولانا آزاد ص ۸۴
[۵۲] - دھیرو بھائی ڈیسائی بھولا بھائی ڈیسائی کے بیٹے کا نام ہے کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔

ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں...... میں نے دھیرو سے کہا مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا۔ ان سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا، کپڑے پہنے چند ضروری خطوط لکھے۔ اور باہر نکلا تو پانچ بج کر ۴۵ منٹ ہوئے تھے...

"کاروکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پہنچی تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی حصار میں تھا۔ اگرچہ مقامی ٹرینوں کی روانگی کا وقت گزر رہا تھا لیکن مسافرو کا داخلہ روک دیا گیا تھا...... ایک انجن رستوراں کار کو ڈھکیل ڈھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا یہی کاروانِ خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لیے تیار کیا گیا ہے...... ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آچکے ہیں جو نہیں آئے ہیں وہ آتے جاتے ہیں۔"

"انڈیا ونس فریڈم" میں مولانا نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ان کے پہنچتے ہی جواہر لال نہرو، آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود بھی آگئے۔ انہوں نے بتایا کہ گاندھی جی بھی اسٹیشن لائے جا چکے ہیں اور ایک دوسرے ڈبے میں لے جائے گئے ہیں۔ ساڑھے سات بجے کے بعد ٹرین روانہ ہوئی اور کلیان سے گزر کر پونا کی راہ اختیار کی۔ "غبار خاطر" کے مطابق "جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر کچھ رفقا اتار لیے گئے۔" لیکن "انڈیا ونس فریڈم" کے مطابق یہ واقعہ پونا ہی کے اسٹیشن کا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ بھی مولانا نے بیان کیا ہے، جو غبار خاطر میں جگہ نہیں پا سکا ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گرفتاری کی خبر پونا پہنچ چکی تھی۔ سارا پلیٹ فارم پولیس کے سپاہیوں سے بھرا تھا اور پبلک کے کسی آدمی کو وہاں آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ لیکن پل پر لوگوں کا خاصا ہجوم تھا گاڑی جوں ہی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی مجمع نے "گاندھی جی کی جے" کے نعرے لگائے اس کے ساتھ ہی پولیس کمشنر نے لاٹھی چارج کا حکم دیا...... جواہر لال کھڑکی سے لگے بیٹھے تھے۔ پولیس نے جوں ہی لاٹھی چارج شروع کیا، وہ کمپارٹمنٹ

سے کود کر پلیٹ فارم پر آگئے اور "تمہیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے" کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ پولیس کمشنر ان کے پیچھے دوڑا۔ اور انہیں کمپارٹمنٹ میں واپس لانے کی کوشش کی۔ جواہر لال نے اس کی ایک نہ سنی اور آپے سے باہر ہو گئے۔ اسی درمیان میں ورکنگ کمیٹی کے ایک اور ممبر شنکر راؤ دیو بھی کود کر باہر نکل آئے۔ انہیں پولیس کے چار سپاہیوں نے گھیرے میں لے لیا اور ٹرین میں واپس جانے کے لیے کہا جب شنکر راؤ نے انکار کیا تو ان سب نے انہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا۔ میں نے جواہر لال کو آواز دے کر کہا کہ انہیں واپس آجانا چاہیے۔ انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا لیکن میری بات مان لی۔ پھر پولیس کمشنر میرے پاس آیا اور معذرت کرتے ہوئے اس نے کہا — "جناب ہمیں افسوس ہے، لیکن ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے، اور اس کا بجا لانا ضروری ہے۔"

"میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ مسز سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی ٹرین سے لے جائے جا رہے ہیں...... گاندھی جی کے اتارے جانے کے بعد ٹرین پھر روانہ ہوئی۔ اب مجھے خیال ہوا کہ ہمیں احمد نگر لے جایا جا رہا ہے۔"

"احمد نگر کے نام سے حافظہ نے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیئے۔" مولانا آزاد "غبار خاطر" میں لکھتے ہیں — "ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے ایک میدان پر نگاہ جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ویسا ہی منظر میرے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا۔ احمد نگر اپنے چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے ہوئے ورق پر ورق الٹتا جاتا۔ ایک صفحے پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا......"

"دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے۔ ان ہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا...... اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے راہ میں

کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے جب قدم اٹھا دیا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں۔ لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے.....

"قلعہ کے اندر ...... ایک احاطہ کے سامنے ...... کاریں رک گئیں اور ہمیں اترنے کے لیے کہا گیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی نے، جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کی۔ وہ فہرست لے کر دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی...... اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہو گئے۔

درجستیم رے مانہ کشتی زحمت سراغ
جاے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

"دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہو گا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ...... مغربی رخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر جو کہ بچھی ہوئی تھی، دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری...... تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا...."

ایک چھوٹا سا واقعہ جو "انڈیا ونس فریڈم" میں ملتا ہے یہ ہے کہ زندانیوں کے لیے کھانا لوہے کی رکابیوں میں پروسا گیا۔ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جیلر کو جب بتایا گیا کہ "ہم لوگ چینی کی رکابیوں میں کھانے کے عادی ہیں" تو اس نے معذرت کی کہ آج اس کا انتظام نہیں ہو سکا ہے اور کل سے کھانے کی میز پر ڈنر سیٹ ضرور ہو گا۔

بارک کی قطار کا پہلا کمرہ مولانا کا تھا۔ دوسرے میں جواہر لال تھے اور تیسرے میں ڈاکٹر سیّد محمود اور آصف علی تھے۔ آخری کمرہ ڈائننگ ہال تھا۔ جہاں کے اوقات یہ تھے — ناشتہ ۸ بجے، دن کا کھانا ۱۱ بجے، شام کی چائے ۴ بجے اور رات کا کھانا

۸ بجے۔ دن کے کھانے کے بعد سب لوگ مولانا کے کمرے میں جمع ہوتے اور کوئی دو گھنٹے تک دنیا بھر کے مسائل پر باتیں ہوتیں۔ شام کی چائے کے بعد کچھ دیر ورزش کی جاتی اور رات کو کھانے کے بعد ڈائننگ ہال میں نشست ہوتی۔

جواہر لال نے کرشنا کو جو خطوط لکھے ہیں، یہ بڑی حد تک کاروباری تھے۔ لیکن ان میں بھی ایسے روزن مل جاتے ہیں جن سے جھانک کر جواہر لال کے ذہن کی جھلکیاں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے خط میں جو پہلی بات انہوں نے لکھی ہے اس سے ان کے کردار کا ایک اہم پہلو ہمارے سامنے آتا ہے:

"مجھے فکر ہے کہ الٰہ آباد میں ہمارے جو ملازمین ہیں، انہیں بڑھتی ہوئی گرانی سے تکلیف کا سامنا نہ ہو۔ حال ہی میں کچھ مزید الاؤنس انہیں دیا گیا ہے لیکن شاید اس سے ان کا کچھ زیادہ بھلا نہ ہوا ہوگا۔ قیمتوں کے بڑھنے کی رفتار کا مجھے اندازہ نہیں ہے، لیکن میرا گمان ہے کہ وہ اوپر ہی جا رہی ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام آدمیوں کے جن میں ہری بھی شامل ہے مطالبات اچھی طرح پورے کیے جائیں بلکہ اس معاملے میں فیاضی برتی جائے۔ اگر ضرورت سے کچھ زیادہ بھی انہیں مل جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تم اس سلسلے میں لاڈلی بھائی کو لکھو اور میرا یہ پیغام ان تک پہنچا دو۔"

اسی خط کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"چاق و چوبند اور خوش رہا کرو۔ پریشان مت ہو۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ غالب کا ایک شعر تمہیں لکھوں۔ لیکن لکھوں گا نہیں —— صرف اس خیال سے کہ جن ذہین اور طباع لوگوں سے یہاں ہمارے خطوط کو سابقہ پڑتا ہے کہیں یہ شعر ان کی فہم سے بالاتر نہ ہو۔ مولانا کی مدد سے اردو شاعری کی میں نے غواصی شروع کی ہے۔"

یہ اقتباس صرف اس لیے نقل نہیں کیا گیا ہے کہ اس میں مولانا آزاد کا ذکر ہے بلکہ اس سے اردو کے ساتھ جواہر لال نہرو کے ذہنی ربط کا بھی پتا چلتا ہے۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ احمد نگر کی فرصت اور مولانا کی معیت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے سب سے پہلے اردو شاعری کے مطالعے ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ......

مولانا آزاد روزمرہ کے اپنے معمولات میں منٹ، سکنڈ کی حد تک وقت کی پابندی ضروری سمجھتے اور برتتے تھے۔ احمد نگر میں بھی انہوں نے کبھی اس میں فرق نہ آنے دیا۔

"چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں" مولانا آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں، "جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا، اور کمروں کی قطار کے آخری کمرے میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں۔ اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی ہے اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔"

جواہر لال نہرو، مولانا کی اس عادت کا گلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم سب یہاں بڑے نظم و ضبط کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مولانا ہیبت ناک حد تک وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم سب ہر لحظہ چوکنا رہتے ہیں کہ کسی وقت چند سکنڈ کی بھی دیر نہ ہو جائے۔ بہت سے لوگوں کو جن کی عادتیں اور جن کے مذاق ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں، ایک جگہ لا کر بند کر دینا کچھ عجیب سی، مگر دلچسپ بات ہے، جس پر کبھی کبھی جھنجھلاہٹ بھی آتی ہے۔"

مولانا آزاد چینی چائے کے رسیا ہی نہیں بلکہ عاشق تھے۔ اس کے رنگ، بو اور کیف و سرور کا ذکر کرتے وقت ان کا قلم وجد کرنے لگتا ہے۔ ان کی چائے نوشی کا وقت بھی عجیب تھا رات کے پچھلے پہر، جب ساری دنیا میٹھی نیند کے نشہ میں سرشار ہوتی ہے، مولانا اس وقت چینی چائے سے کیف و سرور حاصل کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ . . . . . . چائے پی رہا ہوں . . . بہت لطیف ہے . . . رنگ اس قدر ہلکا کہ واہمہ پر اس کی ہستی مشتبہ ہو جاتی ... ... کیف اس قدر تند کہ بلا مبالغہ اس کا ہر فنجان قاآنی کے رطل گراں کی یاد تازہ کر دے۔

ساقی بدہ رطل گراں زاں مے کہ دہقاں پرورد!"

چائے اور چائے نوشی کے باب میں مولانا آزاد "اصحاب نظر" کے اس قول پکار بند

تھے کہ "حسن اور فن کے معاملے میں حبّ الوطنی کو دخل نہیں دینا چاہیے۔" اور اسی سلسلے میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ "چائے کے باب میں شاہدانِ ہندی کا نہیں بلکہ خوبانِ چین کا معتقد ہوں۔" اس کی مدح میں جانے کتنے صفحات انہوں نے رنگین کیے ہیں۔

قلعہ احمد نگر کے زندانیوں میں اس "رطلِ گراں" کا بھلا کون حریف ہو سکتا تھا۔

مولانا شکایتاً لکھتے ہیں :

"یہاں ... ... اس جنسِ کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ کے شائق ہیں ... دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دور واقع ہوئی ہے۔ عمریں گزر جائیں، پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوقِ لطیف کا شہرستانِ کیف و سرور، اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری ——

"اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں !

"جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں خواص یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی۔ لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہِ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔ اور اپنی لیپچو پیچو ہی پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا صرف بے سود بلکہ وضع الشئی فی غیر محلّہٖ کے حکم میں داخل تھا۔

"مے بہ زہّاد مکن عرضہ کہ ایں جوہرِ ناب
پیشِ ایں قوم بہ شورا بۂ زمزم نہ رسد"

مولانا کی چینی چائے کا ذخیرہ بالآخر ختم ہو گیا اور آخری ڈبے نے بھی جواب دے دیا۔

"چائے کے ڈبے کی تہہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتّیوں کا چورا بیٹھ جایا کرتا ہے اور اسے ڈبے کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں۔ یہ آخری ڈبہ ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چورا اس کی تہہ میں بھی جمع تھا ... یہ چورا بھی کام میں لایا گیا اور اس کا ایک ایک ذرّہ دم دے کر پیتا رہا۔ جب

فنجان میں چائے ڈالتا تو ان ذروں کی زبانِ حال پکارتی تھی :

"ہر چند کہ نیست رنگ و بویم
آخر نہ گیاہِ باغِ اویم"

"اس تجربے کے بعد خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں آپ سرجوشِ خم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں تو کاش اس تہہ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مل جایا کریں۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے :

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
یُوں ہے کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے"

احمد نگر اور قرب و جوار کے "بازاروں میں کوئی اس جنسِ گراں سے آشنا ہی نہ نکلا۔ "شاہدِ چین" کے ہجر نے مولانا کی زندگی اجیرن کر دی۔ مجبوراً ادھ ہی "ہندستانی سیاہ پتّی" پینے اور "مستقبل کی امیدوں پر" جینے لگے۔ جیلر نے ہندستان کے مختلف شہروں کی بڑی دکانوں میں اس کی جستجو شروع کی۔ جواہر لال نہرو نے کرشنا کو لکھا اور فرمایش کرتے ہوئے چند سطروں میں ساری رام کہانی بھی سُنا دی :

"مولانا کی ایک خدمت شاید تم انجام دے سکو۔ چینی چائے، وہائٹ جیسمین کے وہ حد درجہ شائق ہیں۔ چار بجے صبح کے لگ بھگ، اور کبھی کبھی دوسرے وقتوں میں بھی، وہ اسے تنہا ہی پیتے ہیں۔ اس کا جو ذخیرہ ان کے ساتھ تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ یہاں یہ چائے ملتی نہیں۔ بمبئی میں مل سکے تو تم اس کا ایک ڈبّہ مہربانی کر کے بھیج دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں بھی ایسی چیزوں کا ملنا آسان نہ ہوگا! وہائٹ جیسمین نہ ملے تو اس سے قریب تر ہی کوئی چائے مل سکے تو وہی بھیج دینا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خاصی قیمتی بھی ہوگی!"

بالآخر "شاہدِ چین" کے وصل سے شادکام ہونے کی خبر سُنیے :

"تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی محرومی و انتظار کے بعد پرسوں چیتا خاں نے مژدۂ کامرانی سنایا کہ بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے وہائٹ

جیسمین چائے کہیں سے ڈھونڈھ نکالی ہے اور ایک پاؤنڈ پارسل کر دیا ہے۔ چنانچہ کل پارسل پہنچا۔ چیتا خاں نے اس کی قیمت کا گلہ کرنا شروع کیا کہ تمہیں ایک پاؤنڈ چائے کی اتنی قیمت دینی پڑی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کی ارزانی نے حیران کر دیا ہے۔ اس نایابی کے زمانے میں اگر اسٹور اس سے دوگنی قیمت کا طلب گار ہوتا، جب بھی یہ جنسِ گراں مایہ ارزاں تھی :

"اے کہ می گوئی، چرا جامے بہ جانے می خری
ایں سخن با ساقیِ ما گو کہ ارزاں کردہ است

"حسنِ اتفاق دیکھیے کہ اِدھر یہ پارسل پہنچا، اُدھر بمبئی سے بعض دوستوں نے بھی چند ڈبے چینی دوستوں سے لے کر بھیج دیے۔ اب گرفتاری کا معاملہ جتنا بھی طول کھینچے، چائے کی کمی کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔"

مولانا نے بمبئی کے جس دوست کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ کرشنا ہتھی سنگھ ہی ہیں۔ جواہر لال نہرو ایک خط میں کرشنا کو لکھتے ہیں :

"تمہارا بھیجا ہوا پارسل آج ہی ملا۔ جس میں چینی چائے، میری پرانی عینک ...... بھی ہے۔ مولانا کی خواہش ہے کہ چینی چائے کے لیے، اور اس زحمت کے لیے جو اسے حاصل کرنے میں تم نے اٹھائی ہے، میں ان کی طرف سے تمہارا شکریہ ادا کر دوں اور ریو، ڈی کلوں کے لیے بھی۔ چائے دیکھ کر مولانا بہت خوش ہوئے۔"

مولانا آزاد قلعہ احمد نگر ہی میں محبوس تھے کہ ۹ راپریل ۱۹۴۳ء کو ان کی رفیقۂ حیات نے چند روز کی علالت کے بعد کلکتے میں وفات پائی۔ عام حالات میں بھی اس نوع کے سانحے بڑے صبر آزما ہوتے ہیں اور مولانا جن حالات سے دوچار تھے، انہوں نے صورتِ حال کی صبر آزمائی اور روح فرسائی کی کوئی انتہا ہی نہیں رکھی تھی۔ اس وقت یہ احساس بھی ان کے لیے سوہانِ روح رہا ہوگا کہ مرنے والی کو ازدواجی زندگی کی وہ نعمت کبھی بھی پوری طور پر میسّر نہ ہو سکی جو شوہر کی مسلسل معیت سے حاصل ہوتی

ہے کیونکہ مولانا نے زندگی کا تقریباً تہائی حصہ جیل میں یا سفر میں گزارا تھا اس سانحے کے سلسلے میں ان کا ایک طویل مکتوب "غبارِ خاطر" میں ملتا ہے جس کا ہر ہر جملہ ان کے ذہنی کرب کی صدائے بازگشت ہے۔

مولانا نے اپنے ذہنی کرب کا جو نقشہ پیش کیا ہے، جواہر لال نہرو نے بھی اس صورتِ حال پر ایک خط میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"مولانا کی بیگم کی وفات سے ہم سب کو ایک دھکا سا لگا ہے۔ کئی دن ہم نے غم و الم کی چھاؤں میں بسر کیے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی ان کا رکھ رکھاؤ حیرت ناک رہا ہے۔ لیکن ظاہری نمائش سے ان جھریوں پر پردہ نہیں ڈال سکتے جو ان کے چہرے پر پڑ گئی ہیں۔ مجھے ان کی طرف سے بڑی تشویش ہو گئی ہے۔ حد درجہ حساس ہونے کے باوجود، اپنے جذبات و احساسات پر پردہ ڈالنے والے اپنی صحتیں بگاڑ لیا کرتے ہیں۔ ان کی مدد کرنے یا ان کے کام آنے کو میرا جی چاہتا ہے، مگر یہاں اس کی بہت کم گنجائش ہے۔"

اس سانحے پر، چند مہینے ہی گزرے تھے کہ اسی نوع کے ایک سانحے سے جواہر لال نہرو کو بھی گزرنا پڑا۔ وِجے لکشمی پنڈت کے شوہر رنجیت پنڈت، یکایک جیل میں بیمار ہوئے۔ اور جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جواہر لال پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا، اس کا کچھ اندازہ ان کے خط کے اس ٹکڑے سے لگایا جا سکتا ہے :

"انہیں [رنجیت پنڈت کو] اس دنیا سے گزرے ہوئے تین ہفتے بیت چکے ہیں۔ میرا ذہن اس تمام عرصے میں، اس حقیقت کو قبول کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ تاہم کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ انہیں مرے ہوئے تو ایک جگ بیت چکا ہے۔ لیکن بالآخر اسے ماننا تو پڑے گا کہ الگ رہنے اور ڈیڑھ سال کی جدائی نے اس سارے قصّے کو ذہن اور تصور کا معاملہ بنا دیا ہے۔"

"ہر موت افراد ہی کے توازن کو نہیں بلکہ قبیلوں نیز خاندانوں اور دوستوں کے گروہوں کے توازن کو بھی درہم برہم کر دیتی ہے ایک خلا

پیدا ہوتا ہے اور یہ خلا پر نہیں ہوتا۔ تاہم قدرت ایک نیا توازن پیدا کر دیتی ہے۔"

اس دنیا کے اور کارخانوں کی طرح، بالآخر قلعہ احمد نگر کے کارخانہ کے بند ہونے کا بھی وقت آ ہی گیا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۵ء کے خط میں جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

"اپنے اپنے صوبوں میں ہمیں منتقل کیے جانے کی خبریں اخباروں میں پڑھتے پڑھتے میں تو اکتا گیا ہوں۔ لیکن اب تو لگتا ہے کہ مستقبل قریب ہی میں کوئی اس طرح کی بات ہونے والی ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگوں سے تو کہہ دیا گیا ہے کہ چند دنوں کے اندر یہاں سے روانگی کے لیے وہ تیار رہیں ہم کہاں لے جائے جائیں گے، یہ ایک سرکاری راز اور بڑا معمّا ہے... احمد نگر کے قلعے سے شاید یہ میرا آخری خط ہو۔ آج ہم نے یہاں کے قیام کے ۹۶۰ دن پورے کر لیے ہیں۔ زندگی کا کتنا بڑا وقفہ ہے یہ۔ لیکن لمبی سے لمبی گلی بھی کہیں نہ کہیں مڑتی ضرور ہے۔ چنانچہ ہم بھی مڑ رہے ہیں — ایک دوسرے جیل کی طرف۔"

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق سردار پٹیل اور شنکر راؤ دیو نے سب سے پہلے قلعہ احمد نگر کو خیرباد کہا۔ یہ دونوں پونا لے جائے گئے۔ دوسرا نمبر آصف علی کا تھا جو بٹالہ (پنجاب) لے جائے گئے جہاں دہلی کے سیاسی قیدی رکھے گئے تھے اس کے بعد جواہر لال نہرو کی باری آئی جنہیں نینی اور بریلی سے ہوتے ہوئے الموڑہ لے جایا گیا۔ مولانا آزاد کا نمبر سب سے بعد میں آیا۔ انہیں بنگال کے بانکوڑہ جیل میں لے جایا گیا، جہاں سے وہ جون ۱۹۴۵ء میں رہا ہوئے۔

— — — — —

مولانا آزاد
اپنے معاصرین کے خطوط کی روشنی میں

عبداللطیف اعظمی

مکاتیب کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور ان کی بہت سی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ لکھنے والے کے خلوص دل کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ان سے لکھنے والے کی سیرت اور شخصیت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہ اپنے دور کے سماجی شعور کے صحیح عکاس ہوتے ہیں۔ مگر میں نے اردو کے خطوط کا مطالعہ ایک اور نقطۂ نظر سے کیا ہے، وہ یہ کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان خطوط کے ذریعہ جو گفتگو ہوتی ہے، اس میں دوسروں خصوصاً اپنے معاصرین کا کس انداز سے ذکر آیا ہے۔ اس ذکر کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کہ اس گفتگو کی حیثیت کچھ اس قسم کی ہے جو بند کمرے میں ہوتی ہے، اس لیے یہ گفتگو مکتوب نگار کے صحیح جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میں نے اپنے اس مطالعے میں بہت سی مشہور شخصیتوں کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں، آج کی صحبت میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق پیش کرتا ہوں۔ یہ معلومات ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے دور کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے تھے اور ساتھ ہی ان کی شخصیت بہت ہی متنازع فیہ رہی ہے۔ اس لیے مجھے یہ جاننے کا بڑا اشتیاق تھا کہ مولانا آزاد کے ان معاصرین نے جن سے ان کے معرکے رہ چکے ہیں یا جن کو ان کے سیاسی موقف سے اختلاف تھا، اپنے نجی خطوط میں، جس کو میں نے "بند کمرے کی گفتگو" سے تعبیر کیا ہے، کس پیرایے میں ذکر کیا ہے۔

۱۔ مولانا محمد علی:

اس سلسلے میں میری سب سے پہلے نگاہ مولانا محمد علی پر پڑی کیوں کہ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کا میدانِ عمل مشترک تھا — دونوں پرجوش اور بیباک جرنلسٹ اور تحریک آزادی کے نڈر سپاہی تھے — اس کی وجہ سے جہاں دونوں کے درمیان گہرے روابط تھے، وہاں بہت سے مسائل میں شدید اختلاف بھی تھا۔ مولانا محمد علی کے

رفیق کار اور مخلص ترین دوست مولانا عبدالماجد دریا بادی کے الفاظ میں "مشہور تھا کہ محمد علی اور مولانا آزاد میں صفائی نہیں، اَن بَن کے چرچے ایک ایک کی زبان پر تھے"[۱] اس لیے مجھے امید تھی کہ مولانا محمد علی کے خطوط میں مولانا آزاد کا یقیناً ذکر آیا ہوگا، اس لیے بھی یقین تھا کہ بقول مولانا دریا بادی مولانا محمد علی کے "آخر کے خطوط زیادہ تر اختلافی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز ہیں"[۲] مگر مجھے اپنی کوشش میں سخت ناکامی ہوئی۔ مولانا محمد علی کے خطوط کا سب سے بڑا مجموعہ وہ ہے جسے محمد سرور صاحب نے مرتب کیا ہے اور جو جامعہ ملیہ سے شائع ہوا ہے، کتابی سائز کے کچھ زائد تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس میں مولانا آزاد کا کہیں ضمناً بھی ذکر نہیں آیا ہے، کچھ خطوط مولانا عبدالماجد دریا بادی کی کتاب " ذاتی ڈائری کے چند ورق" میں شائع ہوتے، مولانا دریا بادی سے مرحوم کے جو بے تکلفانہ تعلقات تھے، اس سے دنیا واقف ہے، ان کے خطوط میں مولانا نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے، مگر ان میں بھی مولانا آزاد کا کسی طور بھی ذکر نہیں۔ البتہ پروفیسر محمد سرور صاحب کی مرتبہ کتاب "محمد علی۔ بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے" میں ایک خط ہے، جو ۲۸ئ میں یورپ سے لکھا گیا ہے، اس میں ضمناً ذکر آیا ہے۔ مرکزی خلافت کے سکریٹری مولانا محمد عرفان مرحوم کے نام خط میں لکھتے ہیں: "البتہ ایک صاحب "ابو النصر" جن کا خط مولانا ابوالکلام سے ہو بہو ملتا ہے۔ ان بے چارے نے ایک کاپی ارسال کی ہے"[۳]

۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی :

مولانا محمد علی کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی گرامی شخصیت ہے، جنہوں نے مولانا آزاد کی معیت میں کام کیا ہے، ساتھ ہی جنھیں مولانا آزاد کے موقف سے شدید اختلاف بھی رہا ہے، اسی وجہ سے میرا گمان ہے کہ سید صاحب کے خطوط میں یقیناً مولانا کا ذکر آیا ہوگا، مگر اب تک سید صاحب کے صرف وہ خطوط شائع ہوئے ہیں، جو مولانا سید مسعود عالم ندوی مرحوم کو لکھے گئے تھے۔ ان میں صرف دو جگہ ذکر آیا ہے، ایک ذکر

---

[۱] محمد علی : ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ اول صفحہ ۳۳۳

[۲] ایضاً حصہ دوم صفحہ ۲۷۶۔ [۳] صفحہ ۳۶۵ -

غیر اہم ہے، لکھتے ہیں :

۱۔ "میں آج مولوی ابوالکلام صاحب کی مجلس اصلاح عربی و فارسی کی کمیٹی کی شرکت کے لیے لکھنؤ جا رہا ہوں" (مورخہ ۲۵ مئی ۴۸ئ مکاتیب سلیمان صفحہ ۲۱)

لیکن دوسرا ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس سے علامہ سید سلیمان ندوی کے صحیح خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے سلسلے میں ہے۔ فرماتے ہیں :

۲۔ "ادعائی لوگوں سے میں چو کنا رہتا ہوں ۔ ابوالکلام کے ساتھ بھی میرا یہی معاملہ رہا" (مورخہ ۹ ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ مکاتیب سلیمان صفحہ ۱۶۵)

سنا ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی سید صاحب کے ان خطوط کو جو ان کو لکھے گئے تھے مرتب فرما رہے ہیں۔ سید صاحب اور مولانا دریا بادی میں جس قدر بے تکلفی اور خیالات میں ہم آہنگی ہے اس کی بنا پر مجھے امید، بلکہ یقین ہے کہ ان میں ضرور مولانا آزاد کا ذکر آیا ہوگا، اگر مولانا دریا بادی نے "سنسر" سے کام نہ لیا تو توقع ہے کہ ان کی اشاعت سے بہت سی نئی باتیں منظر عام پر آئیں گی۔[۱]

۳۔ اسی اثنا تے نظر بندی میں مولانا ابوالکلام سے ملاقات باوجود اشتیاق نہ ہو سکی، اس کا افسوس اور حسرت ہے ۔

(بنام مولوی ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی۔ مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۸ء معارف ستمبر ۲۶ء ص ۲۲۴)

۴۔ مولانا شیروانی اور مولانا ابوالکلام کی چھیڑ چھاڑ اخبارات میں آپ پڑھ چکے ہیں، حالانکہ دونوں مولانا شبلی کے واسطہ سے باہم دگر علمی دوست تھے، مگر اختلافِ نظر دونوں کو حق کا منظر دو رنگ دکھا رہا ہے۔ (ایضاً ۲۲۶، ۲۲۵)

۵۔ یہاں آکر (ناگپور بہ سلسلہ اجلاس کانگریس اعظمی) میری طبیعت کچھ اچھی نہیں رہی، اکثر لوگ مبتلائے بخار ہیں، ایک کمرہ میں مولوی ابوالکلام تین روز سے پڑے ہیں، دوسرے کمرے میں محمد علی صاحب کی بیوی انفلوئنزا میں مبتلا ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۸)

۶۔ بیچارہ مولوی مسعود علی صاحب نے ضلع بھر میں (اعظم گڑھ میں بہ سلسلہ خلافت۔ اعظمی)

---

[۱] اب یہ خطوط مرتب ہو کر "مکتوبات سلیمانی" کے عنوان سے شائع ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس مقام پر کچھ ضروری اقتباسات بھی مرتب کر دیے ہیں (شاہجہانپوری)

جلسہ کا پروگرام شائع کیا تھا، تین چار جگہ کے جلسوں کا پروگرام تھا، سب، گڑبڑ ہوگیا، آج دوڑے ہوئے شاہ گنج گئے ہیں بنارس گئے تھے کہ گاندھی جی، محمد علی اور ابوالکلام کو لے آئیں گے۔ گاندھی جی تو صاف نکل گئے، محمد علی صاحب اور ابوالکلام نے ۲۸ر کا وعدہ کیا ہے۔ محمد علی صاحب کا خط آیا ہے کہ وہ تاریخ بھی نہ رہی، ۶ / ۷ مارچ کو وہ آسکتے ہیں، بشرطیکہ اس کے معاوضے میں ایک مہینہ قومی یونیورسٹی (جامعہ ملیہ۔ اعظمی) میں ترتیب نصاب کے لیے قیام کردں دیکھیں مولانا ابوالکلام کیا گل کھلائیں۔ مجھے تو وہ تاریخ بھی ٹلتی نظر آتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۹)

۷۔ شوکت صاحب کے چھ سات تار آئے اور بڑی لجاجت کے، انصاری صاحب کے آئے، ابوالکلام صاحب اور ظفر علی خاں کی طرف سے آئے، میں نے دل پر جبر کر کے سب کو جواب دے دیا ہے۔

۸۔ ..... تیسری کو صبح ۱۰ بجے شاید کلکتہ میں داخلہ ہو، اگر ابوالکلام صاحب نے نہ رد کا تو اسی شب کو پٹنہ روانہ ہو جاؤں گا اور وہاں سے اعظم گڑھ۔

(ایضاً۔ معارف اکتوبر ۶۰ء صفحہ ۳۱۰)

[۹۔ میں سراپا شکوہ ہوں، کہاں تک، اس صحبت کو اس ذکر سے ناگوار کروں۔ مسئلۂ وضع اصطلاحات پر جو پہلا مضمون نکلا تھا، وہ مولوی آزاد کی غیبت میں نکلا، اس لیے میرے نام سے اور خانۂ اصلاح کے ضربات شدیدہ سے محفوظ رہ کر۔ دوسرا نمبر انھیں مطالب پر مشتمل تھا، جن کو آپ نے اور مسٹر ظفر نے بھی چھیڑا ہے۔ لیکن کیا کروں کہ دیگر مضامین کی طرح میرے نام سے معرّیٰ اور ان امور و مطالب ضروری سے معطّل شائع ہوا۔ فہرستِ علوم کے ساتھ جو عبارت ہے، درحقیقت وہ میری نہیں۔ لہٰذا اس کو میری طرف نسبت نہ دیجیے۔

مورخہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۳ء مکتوبات سلیمانی۔ جلد اول ص ۱۴

۱۰۔ البصائر کو آپ کیوں پوچھتے ہیں؟ اس کو کون نکالے؛ وہ الہلال نہیں کہ الفاظ کا طلسم اس کے لیے کافی ہو۔ (ایضاً ص ۱۵)

۱۱۔ ایک بحث یہ ہے کہ آیا مضامین مختلف بلا ترتیب و تقسیم عنوان جمع کر دیے جائیں یا مختلف عنوان مقرر کر کے الہلال کی طرح ہر عنوان کی ایک سرخی قائم کر کے اس کے نیچے مضمون ہوں۔ (۳۱ر جنوری ۱۹۱۴ء ص ۱۶)

۱۲۔ سنا! آپ کے مولانا ابوالکلام نے مجھ کو ایک رجسٹرڈ خط لکھا کہ ۱۳۰ ہم دیتے ہیں اور ۱۰ مـ ماہوار کی ترقی تا ۲۰۰ تمام اسٹاف آپ کے زیرِ نگرانی۔ نام آپ کا اڈیٹری میں ظاہر رہے گا۔ فوراً چلے آیئے۔ بتایئے! میں نے کیا جواب دیا؟ میں نے لکھا کہ آپ بار بار مجھ سے میری علاحدگی کے اسباب اور رنجش کے موجبات پوچھتے ہیں۔ چنانچہ اس خط میں بھی جا صرار پوچھا تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے مختصراً لکھا اور رجسٹرڈ جواب بھیجا۔ لیکن اب تک آواز سے برنہ خاست۔

الہلال کا ویلو منگوا لیا تھا۔ آیا، موصول ہوا، لیکن ایک پرچہ بھی اس کے بعد نہیں ملا۔ مولوی رکن الدین نے لکھا تھا کہ مشرق میں الہلال کے متعلق ہاشمی نذیری نے کچھ لکھا ہے۔ جو کچھ دنوں کے لیے میرے بعد الہلال میں گئے تھے۔ یاللعجب! (ایضاً ص ۱۷ تا ۲۳)

۱۳۔ آپ کے مولانا ابوالکلام نے مجھے کالج کی غلامی پر غیرت دلائی تھی۔ اور الہلال میں بہ معاوضہ ۱۳۰ و بہ ترقی ۱۰ مـ تا ۲۰۰ دعورت دی تھی۔ اور یہ بھی طمع دلائی تھی کہ الہلال بر اعلان نام تمھاری اڈیٹری میں ہوگا۔ مجھ کو کچھ سروکار نہیں۔ میں تمہارا محکوم بن کر رہوں گا۔ وغیرہ ......

بہ دام و دانہ نہ گیرند مرغ دانا را

(۲ر فروری ۱۹۱۴ء ص ۲۸، ۲۹)

۱۴۔ مولوی آزاد کا خط آیا ہے۔ اپنے کو ہمارا ہم عنان ظاہر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دار المصنفین کی ایک اسکیم طیار کر لی ہے۔

ضرورت ہے کہ دار المصنفین کو علی گڑھ اور الہلال دونوں سے بچایا جاتے۔ علی گڑھ میں جو چیز ہوگی آفتاب احمد خاں و امثالہم کے پنجے میں ہوگی۔ الہلال کا کام تخیل سے عمل میں کبھی نہ آئے گا۔ (۲۹ر جنوری ۱۹۱۵ء ص ۳۷)

۱۵۔ دار المصنفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین، عماد الملک اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں اور مولوی ابوالکلام سے گفتگو کر رہا ہوں۔ مولوی عبدالحق کو بھی خط لکھتا ہوں۔

(۹ر فروری ۱۹۱۵ء ص ۳۸)

۱۶۔ آج کل جناب کس شغل میں ہیں، پہلے خط کا جواب نہ ملا۔ البلاغ دیکھا ہوگا، اب تو پہلے سے بھی رنگ زیادہ شوخ ہوگیا ہے۔ علامہ مرحوم کے بعد مشرقی علوم میں اب وہ کس کا ڈر کرتے ہیں۔ (۱۷ر نومبر ۱۹۱۵ء ص ۴۵)

۱۷۔ کلکتہ والے بزرگ سب کچھ میرے سپرد کرتے ہیں (۱۱ر دسمبر ۱۹۱۵ء ص ۴۸)

۱۸۔ مولوی عبدالسلام مضمون لکھ کر حسبِ عادت پشیمان ہیں کہ میں نے ابوالکلام کو کیوں چھیڑا اور علی گڈھ کو بیکار چیلنج دیا۔ (۱۹ر اگست ۱۹۱۲ء ص ۵۹)

۱۹۔ لطیفہ سنیے! ایک صاحب "صحائفِ ابوالکلام" کی ترتیب کی خدمت سپرد کرتے ہیں کہ علاوہ فوائد مالی کے دارالمصنفین کی شہرت بھی ہے۔ (۶ر ستمبر ۱۹۱۶ء ص ۵۹)

۲۰۔ آج کل نظر بندوں سے گفتگو ہے۔ محمد علی اور ابوالکلام (۲۳ر جولائی ۱۹۱۷ء ص ۷۲)

۲۱۔ میں پورا ایک ہفتہ اپنے مرکز سے غائب رہا[1]۔ رانچی پہنچا۔ تین برس کے بعد مولانا ابوالکلام کی زیارت ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے، بڑی مسرت ظاہر کی، خوب خوب صحبتیں رہیں۔ وہ بھی تطبیق معقول و منقول کے دیرینہ ذائقے سے گھبرا گئے ہیں۔ آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے۔ فقہ و عقائد میں، ہر چیز میں ٹھیک ظاہریت مسلک ہے رانچی کی شور و سنگستانی زمین ان کے سحر زبان اور جادو بیان سے پانی ہو گئی ہے، وہ بھی میٹھا۔ مدرسہ کی عمارت چھوٹی لیکن خوبصورت اور شاندار بنی ہے۔ لوگ بہت مانتے ہیں۔ ایک دو تقریریں میری ہوئیں۔ (یکم اپریل ۱۹۱۹ء ص ۱۱۵، ۱۱۶)

۲۲۔ دفعتہً ایک مضمون[2] مولانا ابوالکلام کا اس تاکید کے آیا کہ اسی مہینے میں شائع ہو۔ (۳ر جون ۱۹۱۹ء ص ۱۱۸)

۲۳۔ ۲۸ کو یہاں ابوالکلام آتے ہیں۔ (۱۲ر فروری ۱۹۲۱ء ص ۱۷۴)

۲۴۔ سیرۃ قرآن سے اخذ کرنا اچھا خیال ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مولوی ابوالکلام صاحب نے تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے بھی اس طرز کا رسالہ رکھا ہے۔ شاید عالم مثال میں زیرِ طبع ہو۔ (۲۰ر مارچ ۱۹۲۴ء ص ۲۱۰)

۲۵۔ مولوی عبدالرزاق (ملیح آبادی) کو آپ نے جواب نہایت مسکت دیا۔ مگر یہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ مولوی ابوالکلام کا مقصد اگر یہ ہے کہ "سکوت در موقع تکلم"، تو محمد علی صاحب کا جرم یہ بھی عیاں ہے کہ تکلم در موقعِ سکوت" (۲۵ر اپریل ۱۹۲۴ء ص ۲۱۲)

۲۶۔ مولوی عبدالرزاق کیا موزوں ہوں گے؟ افسوس ہے کہ مولانا ابوالکلام کی صحبت

---

[1] سید صاحب انجمن اسلامیہ کے جلسے میں رانچی تشریف لے گئے تھے۔
[2] یہ مضمون "جامع الشواہد فی دخولِ غیر المسلم فی المساجد" کے عنوان سے تھا۔

میں انھوں نے پایا نہیں، بلکہ کھویا۔ ان کے خیالات اب معمّا ہیں (۱۱ر نومبر ۱۹۳۷ء ص ۲۴۰)

۲۷۔ برادرم مولوی عبدالرزاق کے انقلاب خیال پر ہمدردانہ افسوس و تاسف ہوتا ہے گو وہ اس کا تخم مصر سے لائے مگر یہاں ندوہ میں مولانا امیر علی مرحوم کی صحبت میں وہ بہت کچھ درست ہو گئے تھے۔ مگر اس کے بعد ایک ایسے شخص کی صحبت نے ان کو متاثر کیا جن کی نسبت کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا[1] (۲ر اگست ۱۹۴۸ء ص ۲۴۶)

۲۸۔ مولانا ابوالکلام کا ایک عنایت نامہ اس باب میں آیا ہے جس میں مولانا ملیح آبادی کی طرف سے معذرت کی گئی ہے۔

این ہم غنیمت است (۲۷ر جولائی ۱۹۳۲ء مکتوبات سلیمانی جلد دوم ص ۹)

۲۹۔ کانگریس کی یوپی گورنمنٹ ان مدارس عربی و فارسی کے لیے جو ایڈڈ ہیں، ایک مجلس بٹھا رہی ہے جس کے صدر مولانا ابوالکلام (اور ارکان) مولوی حفظ الرحمن، پروفیسر زبید احمد، پروفیسر حمایت الحسن، اجمل خان ہیں مجھ سے بھی پوچھا ہے۔ (اخیر جولائی ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۹۳)

۳۰۔ میں ۲۳ر کو اکیڈمی میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ اسی تاریخ کو دہلی میں عربی کمیٹی کا جلسہ ہے۔ مولانا ابوالکلام کا شرکت کے لیے اصرار ہے۔ اکیڈمی کو بھی معذرت لکھ دی ہے۔ (۲۰ر اگست ۱۹۴۷ء ص ۱۹۶)

۳۱۔ آپ سے اعانت طلب نہیں ہوا کہ "پیر خود در ماندہ شفاعتِ دیگراں چہ کند"۔ مولوی ابوالکلام کو لکھنے میں حیا مانع آئی۔ جوش صاحب کو اس لیے نہیں لکھا کہ میں سمجھا کہ اس کا تعلق انڈین یونین سے ہے۔ (۳۰ر مارچ ۱۹۴۹ء ص ۲۱۶)

۳۲۔ دہلی میں ابوالکلام صاحب سے ملا تھا۔ بر سبیل تذکرہ آپ کے خط کا اور اپنی کارروائی کا ذکر کیا تھا[2] [۲۳ر اپریل ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۲۴]

اب وہ تذکرے ملاحظہ ہوں، جو مولانا آزاد کے بارے میں ان کے معاصرین کے خطوط

---

[1] اشارہ مولانا ابوالکلام آزاد کی جانب ہے (عبدالماجد دریا بادی)
[2] میں نے سید صاحب کے اجرائے وظیفہ حیدر آباد کے لیے اپنی حقیر کوششوں کا ایک ذریعہ مولانا ابوالکلام کو بھی بنایا تھا۔ (عبدالماجد دریا بادی)

ہیں کسی نہ کسی سلسلے میں آئے ہیں۔ مولانا گوناں گوں خصوصیات کے حامل تھے، مذہب، صحافت، ادب اور سیاست ان کے مخصوص میدان تھے، اس لیے جن لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان میں عالم دین، صحیفہ نگار، ادیب اور سیاست داں سبھی قسم کے لوگ نظر آئیں گے، مگر ان کی خدمات جلیلہ کا بڑا حصہ سیاست سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے قدرتی طور پر سیاستدانوں سے ان کے تعلقات زیادہ رہے ہیں، اس زمانے کے خطوط ابھی بہت کم منظرِ عالم پر آئے ہیں، یہ سب جب شائع ہوں گے اس وقت مولانا آزاد کے بارے میں ان کے ساتھیوں اور ہم عصروں کی رائیں بڑی تعداد میں سامنے آئیں گی اور یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ ان کے معاصران کی شخصیت سے کس قدر متاثر تھے، ان کے خیالات وافکار سے کس قدر متفق تھے اور ان کی خدمات اور علمی قابلیت کے کہاں تک معترف تھے۔ میں سب سے پہلے میدان سیاست کے رفیقوں کے خطوط کے اقتباسات نقل کرتا ہوں۔ مہاتما گاندھی اپنی عظیم الشان شخصیت کی بنا پر جہاں مولانا آزاد کے بزرگ تھے، وہاں ان کے رفیق کار بھی تھے۔ ان ہی کے تذکروں سے ابتداء کرتا ہوں۔

۳۔ مہاتما گاندھی :

۱۔ مولانا صاحب ایک دن کے لیے واردھا میں ٹھہر گئے اور ہم نے ایک طویل گفتگو کی۔ انھوں نے مجھے اس سمجھوتے کا مسودہ دکھایا جو اسمبلی کے مسلم لیگی اور کانگریسی ممبروں کے درمیان ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک عمدہ دستاویز تھی۔ مگر انھوں نے مجھے بتایا کہ تم تو اسے پسند کرتے ہو، مگر ٹنڈن جی پسند نہیں کرتے۔ میں نے مولانا کی تجویز کے مطابق اس سلسلے میں موخرالذکر کو ایک خط لکھا ہے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟

(بنام پنڈت جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۲۲ر جولائی سنہ ۱۹۳۷ء۔ چند پرانے خط ص ۸۲-۲۸۳)

۲۔ میں لو مہادیو کی یادداشتوں کی نقل جو انھوں نے اپنی سیاحتِ صوبۂ سرحد پر لکھی تھیں، ...، میں یہ یادداشتیں تمام ممبروں کے پاس گشت نہیں کرا رہا ہوں، بلکہ ان کی نقلیں صرف مولانا اور سبھاش کو بھیج رہا ہوں۔ (ایضاً۔ مورخہ ۲ر اپریل سنہ ۳۸ء حصہ دوم صفحہ ۵۷)

۳۔ میرے اُس تار کے جواب میں جس میں مَیں نے سبھاش کو مشورہ دیا تھا کہ جناح سے باضابطہ گفت و شنید کا آغاز کر دیں، انھوں نے مجھے تار دیا ہے کہ وہ دسویں کو بمبئی میں

ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی وہاں پہلے ہی پہنچ جاتے۔ میں مولانا صاحب کو بھی اسی انداز کا ایک خط لکھ رہا ہوں اور اِس خط کی نقل ان کو بھیج رہا ہوں۔

(ایضاً۔ مورخہ ۳۰ر اپریل سنہ ۳۸ء حصہ دوم صفحہ ۶۱)

۴۔ اگر تم تیار ہو تو اب تم ضابطے کے ساتھ سول نافرمانی کا اعلان کر سکتے ہو ..... مولانا صاحب نے ٹیلی فون پر مجھ سے فرمایا کہ دوسری سینہ گرہ کے لیے کسی دوسرے شخص کا انتخاب کرنا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ اگر تم (یعنی جواہر لال۔ اعظمی) آنے پر تیار ہو تو میں کسی دوسرے شخص کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ (ایضاً۔ مورخہ ۲۴ر اکتوبر سنہ ۴۰ء حصہ دوم صفحہ ۳۳۳)

۵۔ مولانا صاحب مصر تھے کہ مجھے الہ آباد جانا چاہیے۔ میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ آج کل میرے لیے سفر کرنا دشوار ہے۔ علاوہ بریں میں نے اسی زمانے میں تین میٹنگیں طلب کی ہیں اس لیے مولانا سے میں نے معافی مانگ لی اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں اپنی رائیں ایک قرارداد کی شکل میں بھیج دوں گا۔ (ایضاً۔ ۲۴ر اپریل سنہ ۴۲ء۔ حصہ دوم صفحہ ۳۸۳)

۴۔ پنڈت موتی لال نہرو :

..... شفیع مسلک کے چند کٹر قسم کے رجعت پسندوں کے سوا مسلمانانِ پنجاب کی اکثریت نے لکھنؤ کی قراردادوں سے اتفاق کا ابھی سے اعلان کر دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو شملہ والی میٹنگ میں شریک تھے، ہمیں یقین دلایا ہے کہ پنجاب سے بھی بہتر نتائج بنگال میں ہمارے سامنے آئیں گے اور مجھے ان کی کامیابی کا یقین ہے بشرطیکہ سرمایہ کافی رہا۔

(بنام ڈاکٹر بیسنٹ۔ مورخہ ۳۰ر ستمبر سنہ ۲۸ء کچھ پرانے خط۔ حصہ اوّل صفحہ ۱۰۶)

۵۔ پنڈت جواہر لال نہرو :

۱۔ میں نے (مہادیو کی صوبہ سرحد سے متعلق) یادداشت کو پڑھ لیا ہے اور اب میں خاں صاحب کو اور خان عبدالغفار خاں کو خط لکھوں گا ..... آپ کے علاوہ اگر کوئی شخص اس کام کو موثر طریقے پر انجام دے سکتا ہے، تو وہ مولانا ابوالکلام ہیں۔ میرے خیال میں اُن کا صوبۂ

سرحد جانا نہایت ضروری ہے۔ (بنام مہاتما گاندھی مورخہ ۲۸ر اپریل ۳۸ء ۔ ایضاً حصہ دوم صفحہ ۵۸)

۲۔ گاندھی جی مولانا آزاد کو دیکھنے کی غرض سے آج الہ آباد پہنچے۔

(بنام سرت چندر بوس، مورخہ ۲۴ر مارچ ۳۹ء ۔ ایضاً صفحہ ۱۲۰)

۳۔ باردولی میں جو واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ میں نے، گاندھی جی نے اور دوسرے لوگوں نے مولانا آزاد پر دباؤ ڈالا کہ وہ صدارت کے لیے اپنا نام پیش کرنے کی اجازت دے دیں۔ مولانا اس پر آمادہ نہیں تھے۔ جس روز میں باردولی سے روانہ ہو رہا (تمھارے جانے کے بعد دوسرے دن) میں گاندھی جی اور دوسرے لوگوں کو خدا حافظ کہنے گیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ گاندھی جی کی جھونپڑی کے برامدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ولبھ بھائی اور مولانا کے سوا اور کون لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ مولانا نے پھر کہا کہ ان کو اس ذمے داری کے قبول کر لینے میں پس و پیش ہے۔ اس پر ولبھ بھائی نے کہا کہ اگر مولانا انکار کر دیں تو ڈاکٹر پٹابھی سے کہا جائے کہ وہ کھڑے ہوں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر پٹابھی کا نام میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ولبھ بھائی کی تردید کیے بغیر کہا کہ مولانا کو اس پر ضرور رضا مند کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد فوراً ہی میں باردولی سے روانہ ہو گیا۔ الہ آباد پہنچنے پر مجھے ایک تار اس مضمون کا ملا کہ مولانا رضا مند ہو گئے۔

(بنام سبھاش چندر بوس۔ مورخہ ۳ر اپریل ۳۹ء ۔ ایضاً صفحہ ۱۷۸-۱۷۹)

۴۔ میں نہیں جانتا کہ تمھارے لیے کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک رکن کی حیثیت سے جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ ان خطوط پر جن کی تم تصریح کرتے ہو، کسی سمجھوتے یا مفاہمت کی تجویز پیش کرنا کہاں تک درست ہوگا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ اس تجویز سے انتشار اور غلط فہمی پیدا ہو گی۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم مولانا آزاد سے مشورہ کر لو؟ وہ کل یہاں آ رہے ہیں اور تین چار دن ٹھہریں گے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمھارا ٹائپ کیا ہوا مسودہ ان کو دے دوں۔

(بنام سید محمود۔ مورخہ ۲ر فروری ۴۱ء ۔ ایضاً صفحہ ۳۶۷)

۶۔ سید وزیر حسن :

میری یہ قطعی رائے ہے کہ تا حد امکان بڑے سے بڑے پیمانہ پر ایک عام جلسہ ایسے تمام مسلمان طبقوں اور عوام کا جو کانگریس کا نصب العین قبول کر چکے ہیں، نیز ان مسلمانوں کا جن کو میں کانگریسی خیال کا کہہ سکتا ہوں، کسی مرکزی جگہ جلد ہی مارچ کے اخیر تک یا اپریل کے

شروع میں منعقد کیا جائے اور ضروری تجویزیں منظور کر کے مسلم لیگی پروپیگنڈے کی تردید میں ایک عام بیان جاری کیا جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس جلسے کے داعی ہوں۔

(بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۱۱ر فروری ۳۸ء ۔ ایضاً صفحہ ۴۸)

۷۔ سبھاش چندر بوس :

مجھے بتایا گیا ہے کہ جب تم دہلی میں تھے تب تم نے مہاتما گاندھی تک یہ پیغام پہنچایا کہ مولانا آزاد سے ملنے کے لیے انھیں الہ آباد جانا چاہیے۔

(بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۲۸ر مارچ ۳۹ء ۔ ایضاً صفحہ ۱۵۳)

۸۔ خان عبدالغفار خاں :

آتے وقت میں مولانا صاحب سے بھی ملا تھا اور میں نے ان سے ایک بات عرض کی تھی، جس کے متعلق انھوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ٹیلی فون پر آپ سے باتیں کریں گے۔ ممکن ہے انھوں نے آپ سے باتیں کی ہوں۔ دراصل یہ بات میں نے سیگاؤں میں مہاتما جی سے سنی تھی وہ اس خیال سے کسی قدر پریشان تھے کہ جواہر لعل ان کی رائے سے قطعاً اتفاق نہیں رکھتے یہ قصہ ونو باکی گفتگو کے بعد کا ہے اور وہ اُس وقت پس و پیش میں تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ میں پنڈت جی سے اسٹیشن پر ملا تھا اور ان سے بات چیت بھی کی تھی جو بالکل اطمینان بخش تھی۔ کچھ لوگوں کو (کچھ شکوک ؟) تھے۔ اس لیے پہنچنے پر میں نے مولانا صاحب سے اپنے خیالات عرض کیے اور انھوں نے مجھ سے اتفاق فرمایا۔ — یہ طے پایا کہ ٹیلی فون سے آپ کو مطلع کر دیا جائے مجھے امید ہے کہ آپ مہاتما جی کو لکھ دیں گے تاکہ معاملات کی صورت وہی ہو جائے جو مہاتما جی چاہتے تھے۔ مولانا صاحب اور میں یہی چاہتے ہیں۔ (بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۱۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء ۔ ایضاً صفحہ ۳۲۹-۳۳۰)

۹۔ پُرنیما بنرجی :

یہاں (الہ آباد) سے رخصت ہونے سے پہلے مولانا سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہوں، مجھ کو یقین ہے کہ گرمی اور جیل کی زندگی ان کے سکون میں خلل انداز ہونے یا زندگی سے متعلق

ان کا جو عام انداز ہے، اس سے اُن کو برگشتہ و منحرف کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ (بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۷ رمئی ۱۹۴۱ء ایضاً صفحہ ۳۳۹)

۱۰۔ جی۔ ادھیکاری (کمیونسٹ پارٹی کے ایک سربرآوردہ ممبر) :

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بر دست قوم کے اندر برطانیہ دشمن جذبات کی حرارت بھر دی ہے۔ جب یہ حرارت ٹھنڈی پڑ جائے گی تب قوم اس سے شدید تر ہزیمت خوردگی اور جاپان دوستی کے جذبات کی آغوش میں جا پڑے گی۔ مولانا نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا تھا جو چھپ چھپ کر حملہ آور کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

(بنام پنڈت جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۳ رمئی ۴۲ ۶-۱ ایضاً صفحہ ۷-۳۸۶)

۱۱۔ آصف علی :

یہاں (قلعہ احمد نگر) سے تمہارا جانا مجھے اور مولانا کو فراق کا ایک صدمۂ عظیم پہنچا گیا شام تک تو کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا، مگر دوسرے دن صبح کو یہ فراق بہت کھلا۔ میری روانگی تک مولانا نمایاں طور پر دل گرفتہ سے دکھائی دے رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بر سبیل تذکرہ چلتے چلتے دو ہفتے کی شکر کا کوٹا مجھ پر لاد دیا گیا اور مجھے اس کو بھی اپنے آخری وصیت نامے میں اس کی فیاضانہ تقسیم کے لیے شامل کر لینا پڑا۔ اس وصیّت نامے کو نافذ کرنے والے تنہا مولانا ہوں گے۔ (بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۳۰ راپریل ۵ ۴ء ۔ ایضاً صفحہ ۷،۴)

۱۲۔ ایم۔ این۔ ساہا (یونیورسٹی سائنس کالج۔ کلکتہ) :

کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو اور مولانا آزاد کو کملا لکچرر مقرر کیا ہے۔ باوجودیکہ مسلم لیگیوں نے اس سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ مولانا آزاد اپنا ما فی الضمیر انگریزی میں ادا نہیں کر سکتے۔

(بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۱۲ راگست ۱۹۴۵ء ۔ ایضاً صفحہ ۱۲-۴۱۳)

۱۳۔ ایس۔ ایچ۔ شین (سفیر جمہوریۂ چین متعینہ نئی دہلی) :

حالیہ واقعات اور حالات کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب[1] نے مجھ سے خواہش کی ہے

لہ ڈاکٹر تائی چتیاؤ، صدر امتحان یوان، ایک خیرسگالی مشن کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔

کہ میں ان کی بہترین تمنائیں آپ کو اور مولانا آزاد کو پہنچا دوں۔

(بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۱۵ راگست ۴۶ء ۔ ایضاً صفحہ ۴۱۴)

۱۴۔ ڈاکٹر اقبال :

۱۔ الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی[1] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں، پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔

(بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ مورخہ ۳ راپریل ۱۹۲۰ء اقبال نامہ صفحہ ۱۔۱۰۰)

۲۔ مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر (انگریزی و اردو) موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت سے ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضرور نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے[2]۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۱)

لہ رانچی کی نظربندی سے جنگ عظیم اول کے بعد رہائی ملی تھی۔

۲ سید صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے شکوہ کی مولانا آزاد کو اطلاع کر دی تھی۔ چنانچہ مولانا آزاد مرحوم اپنے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں: "ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی، اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے۔ در اصل اس کمبخت تذکرہ کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظرثانی کے لیے بھیجا تھا، میں نے واپس نہیں بھیجا؛

بقیہ اگلے صفحہ پر

۳- الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال علما کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۱۹۹)

۴- باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر پہ ہے یا ہونا چاہیے، اس کے متعلق کیا عرض کروں مقصود تو بیداری سے تھا، اگر بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں، لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابو الکلام صاحب آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور میری طرف اشارہ کیا ہے، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی ہے، لیکن کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملے میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں:

(بنام عشرت رحمانی - مورخہ ۳۰ر اگست ۱۹۲۱ء - اقبال نامہ)

۱۵- اکبر الہ آبادی:

اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مُصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ صرف اتنا ٹکڑا احد درجہ ضمنی مطولات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکردہ ہو گیا۔ خیال کیا کہ مقدمے کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہو گا، لیکن انھوں نے بجنسہٖ چھاپ کر، جلد باندھ کر یکایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے علاوہ ڈاکٹر اقبال کے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرز تحریر یا سند لال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس مرتبہ جب وہ جلسہ کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی معلوم کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا، جو کبھی کہا تھا، حالانکہ میں نے جو بات کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔

(۲ر جنوری ۱۹۲۰ء)

۱- ...... اسی ضمن میں پین و پلیژر[1] اور چند دیگر الفاظ کے متعلق کچھ نوٹ لیے تھے۔ الہلال میں یہ بحث دیکھ کر میں نے بغیر زیادہ غور کیے ایک خط اڈیٹر صاحب کو لکھ دیا، جس کو انھوں نے چھاپ دیا...... میں اپنے خط کو واپس لیتا ہوں۔

(بنام مولانا عبد الماجد دریابادی - مورخہ ۲۶ر اگست ۱۹۱۳ء خطوط مشاہیر، ۴۱، ۴۲)

۲- میں نے ابھی الہلال کو لکھ بھیجا ہے کہ میں اس تحریر کو واپس لیتا ہوں۔ آپ کو بھی اجازت دیتا ہوں کہ ان الفاظ کی بحث میں (جس غرض سے وہ پیش ہے) مجھ کو اپنے خلاف نہ سمجھیے۔ آپ کی کل تحریر سے مجھ کو اتفاق ہے بجز اس کے کہ ہیپی نیس (HAPPINESS) کا ترجمہ لذت میں ابھی نہیں سمجھا۔

(ایضاً - مورخہ یکم ستمبر ۱۹۱۳ء)

۳- میں نے الہلال کے آرٹیکل نہیں دیکھے تھے۔ صرف اسی پر نظر پڑی تھی کہ خط و کرب و لذت و الم میں کس کو ترجیح ہے۔ پچھلے دونوں لفظ بہت مانوس تھے، میں نے الہلال کو دو سطریں لکھ بھیجیں۔ اس کے بعد میں نے آرٹیکل پڑھے، آپ کی مشکلات کا خیال آیا، لہٰذا میں نے دست برداری کی ہے

نہ گفتہ نہ دارد کسے با تو کار　　ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

...... ہاں جناب الہلال صاحب نے میرا خط نہیں چھاپا۔ لکھا کہ میرے دوسرے آرٹیکل کے منتظر رہیے۔ آپ کی فلسفہ دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ میں نے ان کو بھی مشورہ دیا کہ جب جملہ امور متعلقہ پر لحاظ کرنا منظور و ممکن نہیں تو اعتراض سے اعراض اولیٰ ہے۔

(ایضاً صفحہ ۴۹، ۵۲ مورخہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء)

---

[1] (PAIN-PLEASURE) اس وقت یعنی ۱۹۱۲ء میں فلسفہ جذبات لکھ رہا تھا۔ نفسیات کی بہت سی اصطلاحیں اردو میں گویا پہلی بار آ رہی تھیں۔ نو عمری کا زمانہ ایک تو یوں ہی جوش کا ہوتا ہے (میرا سن اس وقت ۲۱ سال کا تھا) پھر پہلی تصنیف، جوش دہرا دہرا تھا۔ مولانا ابو الکلام صاحب الہلال کی فرمائش پر کتاب کا ایک باب الہلال میں اشاعت کے لیے گیا۔ ان دو انگریزی لفظوں کے ترجمے "خط و کرب" تجویز کیے تھے۔ الہلال نے اس پر نوٹ دیا کہ ان کے بجائے "لذت و الم" مناسب ہیں اور اس پر ایک طویل و سرگرم بلکہ تلخ و تند سلسلۂ بحث الہلال ہی میں چل نکلا۔ الہلال نے اپنی تائید میں ایک مکتوب حضرت اکبرؔ کا شائع کیا تھا۔ اس خط اور اس کے بعد والے خطوط میں اشارے اسی بحث سے متعلق ہیں۔ (مولانا عبد الماجد دریابادی)

۴- ..... خط کا ٹھیک اپورٹ ٹرم مجھ کو سوائے حرماں کے کوئی نہیں ملتا لیکن حرماں میں پین کا آئیڈیا مرسی نہیں ہے۔ اردو میں مایوسی کے معنوں میں شعرا کی زبان پر ہے۔ یاس و حرماں غالباً کہہ سکتے ہیں۔ وہ محظوظ ہوئے، میں محروم رہا۔ لذت دالم میں کچھ حرج نہیں، لیکن واضع مصطلحات کو اختیار ہے۔ آپ کے دست الہلال کا زرضمانت ضبط ہوگیا۔

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر ۔۔۔ دور فلک ہلال کو لایا صلیب پر[1]

(ایضاً۔ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء۔ ص ۵۵)

۵- میں نے الہلال کی گواہی اسی سبب سے واپس لی تھی کہ ایک لفظ پر کسی ایک پہلو کے لحاظ سے ٹوک دینا آسان ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی نظر میں مفہومات فلسفہ ہیں۔ آپ سسٹم چاہتے ہیں، ہمسٹری چاہتے ہیں، نہایت بلند اور مشکل کام ہے، اعتراض بیجا ہے، بجز اس کے کہ آپ ہی کی طرح آپ کے ساتھ اس کام میں دن رات غرق رہے۔

(ایضاً صفحہ ۵۸)

۶- ۲۳ ستمبر کے پرچہ الہلال میں جو فہرست علوم کے نام کی شائع ہوئی ہے، کاش ہر ایک علم کے ساتھ اس علم کے دو ایک مسئلے بھی لکھ دیے جاتے تو یہ فہرست بہت مفید ہو جاتی۔ کیوں نہ صاحب مضمون سے درخواست کی جائے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ الہلال نے موعودہ مضمون شائع کر دیا ہے۔ کس تاریخ کے پرچے میں شائع کیا ہے؟

(ایضاً مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۶۱، ۶۲)

۷- ..... کوشش کیجیے۔ کہ بیان صاف ہو۔ ابوالکلامی نہ ہو۔

(ایضاً مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۶۱، ۶۲)

۱۸- مولوی عبدالحق بابائے اردو:

۱- بڑی فکر یہ ہے کہ دلی میں جا کر ٹھہروں کہاں۔ سوا ابوالکلام آزاد یا رفیع احمد قدوائی کے، دوسری کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔

(بنام مولوی سید ہاشمی فرید آبادی۔ تاریخ درج نہیں۔ اردوئے مصفّٰی صفحہ ۱۵۴)

---

[1] اکبر صنعتوں کے بھی بادشاہ تھے۔ مغرب اور غریب کی اور مغرب اور الہلال کی اور برق، ہلال اور فلک کی مناسبتیں بالکل ظاہر ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)

۲- اب غور طلب مسئلہ انجمن کی منتقلی کا ہے۔ اس پر غور کر رہا ہوں۔ دریا گنج جانے سے سب منع کرتے ہیں۔ اب رہے وہ مکانات جو ہماری زبان پر بنا لیے گئے ہیں، اس بارے میں مولانا اور پنڈت نہرو سے گفتگو کرنی باقی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۱۵۵)

۳- مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور میرے ساتھ رفیق امداد شبر بھی ہیں۔ مجھے وہاں کے قیام سے بہت شرم معلوم ہوتی ہے۔ سچ مچ ایک پناہ گزیں کی حیثیت ہے.... ہم مولانا کے ہاں ناخواندہ مہمان یا پناہ گزینوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ مجھے آتے چوتھا روز ہے، لیکن وہاں ایک ایک دن بھاری ہے اور جب آدمی چائے یا کھانے کے لیے بلانے آتا ہے تو مجھے بے حد شرم معلوم ہوتی ہے۔ ..... آج جب ہم چائے پی رہے تھے تو دفعتہً قاضی عبدالغفار خاں نازل ہوئے اور چائے میں شریک ہوئے۔ رفیق اور شبر سے کچھ علیک سلیک ہوئی۔ وہ بھی مولانا کے مہمان ہیں۔ پہلے مولانا کو جو مکان ملا تھا (شاید پرتھوی راج روڈ پر) وہ بہت وسیع اور عالی شان اور اس کا چمن بہت ہی پر بہار تھا۔ یہ مکان بہت چھوٹا ہے اور مہمانوں کے لیے صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اس میں ہم تین اور ایک اور صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب نے اجمل خاں سے کہا کہ میں ان کے ساتھ نہیں ٹھہروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اتنے میں غدار ملت ..... پہنچے انھوں نے مولانا سے جا کر کہا تو مولانا نے اوپر کی منزل میں اپنے پاس کا کمرہ ان کو دے دیا۔ مولانا ہمارے ساتھ چائے یا کھانا نہیں کھاتے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)

۴- مولانا کے ہاں قیام سے مجھے بہت شرم معلوم ہوتی تھی اور وہاں زیادہ ٹھہرنا مجھے گوارا نہ تھا، اس لیے نظام بلیس میں آگیا ہوں۔

(ایضاً صفحہ ۱۵۸)

۱۷- قاضی عبدالغفار:

۱- آپ کی اخبارات اور رسائل کی فہرست میں میں نے دیکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیغام" اور رسالہ "لسان الصدق" کی چند جلدیں آپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ "آثار ابوالکلام آزاد" کا نیا اڈیشن تیار کر رہا ہوں اور اس سلسلہ میں ان دونوں جرائد کو دیکھنا چاہتا ہوں ..... یہ فائل خود مولانا آزاد کے پاس بھی نہیں ہیں۔ (بنام عبدالقوی دسنوی۔ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۵۶ء)

۲- میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر فلم "مرزا غالب" کے متعلق کوئی اطمینان بخش فیصلہ نہ ہوا تو یہ معاملہ بہت آگے بڑھے گا اور وزیر اعظم اور مولانا آزاد تک جائے گا۔

(بنام شہاب الدین دسنوی - مورخہ ۶ر نومبر ۱۹۵۴ء نقوش - مکاتیب نمبر)

۳- یہ غور کرنے کی بات ہے اگر مرکزی انجمن یا اس کے سکریٹری کی طرف سے کوئی آواز اٹھائی بھی جائے تو اس آواز کو ٹھوس اور ہر طرح مستند مواد پر مبنی ہونا چاہیے، تاکہ جب پنڈت جی یا مولانا سے بات کریں تو ان کے سوالات کا پوری طرح جواب دے سکیں۔

(بنام حمیدہ سلطان - مورخہ ۸ ار نومبر ۱۹۵۴ء - ایضاً)

۱۸- نواب وقار الدولہ و وقار الملک مشتاق حسین خان:

(مسلم یونیورسٹی کے) ڈیپوٹیشن کے ممبروں کے نئے انتخاب کے وقت ایک تو اس بات کا ضرور لحاظ رہے کہ موزوں نام کافی تعداد میں منتخب ہوں، خواہ نخواہ ان کی تعداد میں پہلے سے کمی کر دینا ضروری نہیں اور پھر جو لوگ اہل الرائے اور قوم کے ہمدرد ہوں ان کے انتخاب کی کوشش کی جائے، مثلاً حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب، مولوی ظفر علی خاں صاحب اڈیٹر زمیندار، مولوی وحید الدین سلیم، مولوی ابو الکلام صاحب آزاد۔ . . .

(بنام حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دا تا ؤلی۔ مورخہ ۲۳ر جولائی ۱۹۱۳ء۔ مکاتیب نواب محسن الملک و وقار الملک، صفحہ ۳۱-۱۳۰)

۱۹- مہدی الافادی:

۱- ایک صاحب (ابو الکلام) "مستی"[1] کے پیچھے پڑے ہیں کہ بے لگاؤ اس کا استعمال سنجیدگی کے خلاف ہے۔ ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

پینے کا اقرار کریں یا نہ کریں، لیکن اس خوش کیف شخص نے مخمور آنکھیں (رسیلی نینیاں ٹونا بھری)

---

[1] "وہ سامنے آئینہ تھا مستی تھی"۔ عزیز لکھنوی کے اس استعمال "مستی" پر مولانا ابو الکلام آزاد کو اعتراض تھا کہ بغیر اضافت نہیں آنا چاہیے۔ اس میں ذم ہے ہمدم میں اسی پر مباحثہ رہا تھا۔

تو دیکھی ہوں گی، پھر یہ "تقدس ریائی"، کیا "کفر" نہیں ہے؟

(بنام مولانا عبد الماجد دریا بادی۔ مورخہ ۸ر اگست ۱۹۱۹ء مکاتیب مہدی، ص ۱۱۷)

۲- کلکتہ سے "تذکرہ" (ابو الکلام) کی ایک جلد ہدیتہً ملی۔ رانچی کے بعد یہ دوسری رجسٹری تھی جو میرے نام بھیجی گئی۔ اس امتیاز سے بہت خوش ہوں۔ کیا اب بھی میرے بڑے آدمی ہونے میں شک ہے؟

(ایضاً مورخہ ۳۰ر ستمبر ۱۹۱۹ء۔ صفحہ ۸۵-۸۶)

۳- "تذکرہ" ابو الکلام کی ایک جلد ہدیتہً ملی۔ ظاہری حیثیت سے لائق رشک ہے اور کیوں نہ ہو مسٹر احمد کی مشاطہ گری نے حسن کا غذی کو خوب نکھارا ہے، لیکن سوال یہ ہے کتاب کہاں تک اپنے موضوع کے حدود میں ہے۔ اب تک جس قدر دیکھ سکا، "اسماء الرجال" کا خاکہ ہے، خود رو ریمارکس ہیں، بے ترتیب فصلوں میں جمع کر دیے گئے ہیں، لیکن خاتمہ جان دے دینے کے لائق ہے۔ ذرا اچھی طرح کھلیے گا۔ اظہارِ خیال محفوظ رہے گا۔ الہلالی تبلیغ کو میں پسند تو کرتا ہوں، لیکن افسوس ہے کہ مرض کا یہ اصلی علاج نہیں۔

(بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۱۹ء ایضاً صفحہ ۴۰)

۲۰- مولانا سیماب اکبر آبادی:

یہ آپ بار بار کہتے ہیں کہ تاج کو الہلال ہونا چاہیے اور میں بار بار کہہ دیتا ہوں کہ۔ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست"۔ الہلال ایک مذہبی رسالہ تھا، تاج ایک سیاسی اخبار ہے الہلال ایک رہنمائے ملک کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، تاج ایک شاعر کی اڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے، پھر میں جانتا ہوں کہ سیاست میں مجھے کمال حاصل نہیں، نہ ایک سیاسی شخص کی حیثیت سے میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

(بنام ساغر نظامی۔ مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۲۱ء۔ روحِ مکاتیب حصہ اول صفحہ ۱۹۶)

۲۱- ملا رموزی:

"خطوط رموزی" کے نام سے اردو کے مقبول مزاحیہ نگار ملا رموزی کے کچھ خطوط شائع ہوئے ہیں۔ غالباً یہ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین ہیں جو خطوط کی شکل میں لکھے گئے ہیں، مگر چونکہ اس مجموعہ کو خطوط کی صنف میں شمار کیا جاتا ہے، اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر اس

کے اقتباسات بھی یہاں پیش کیے جائیں۔

"خیام" لاہور کے سالنامہ میں غالباً مولانا آزاد کی کوئی غزل شائع ہوئی تھی۔ ملا رموزی ایڈیٹر خیام شبلی بی کام کو لکھتے ہیں:۔

"مشہور لوگوں کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے، تو حبیب ابوالکلام آزاد ایسے رئیس المشاہیر شاعر کی غزل تک اس میں موجود ہے تو اب اس کے بعد گاندھی جی کی غزل ہی اور رہ جاتی ہے، ورنہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک اردو کا اخبار اپنے سالنامہ میں کیا ستارہ مشتری اور ناہید لے آئے؟" (صفحہ ۲۷-۲۸)

ایڈیٹر رسالہ "ارمغان" دہلی کو اردو صحافت کا ذکر کرتے ہوئے الہلال کے بارے لکھتے ہیں:

"صحافت اردو میں" "الفاظ کا ذخیرہ" بہت خاصا جمع کیا جارہا ہے، رہے علوم یا ٹھوس تحقیق تو اس کا وجود نہ اخبارات اردو میں نہ رسائل اردو میں مگر اس کے اسباب ہیں۔ چنانچہ نمبر ایک یہ کہ اخبار الہلال اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کو ملک میں سب سے سوا اعتبار، اور وقعت کیوں حاصل ہے؟ بس اس لیے کہ ان پرچوں نے جو بلند مضامین پیش کیے؟ محض اس لیے کہ ان کے ایڈیٹروں نے واقعی معنی کے علوم حاصل کیے اور اس طرح کہ ان علوم کی باقاعدہ تکمیل کی، پھر مطالعہ کو وسعت دی، نتیجہ یہ کہ نام پایا۔"

(صفحہ ۱۶۸)

مطبوعات

مولانا آزاد صدی

مولانا ابوالکلام آزاد (شخصی مطالعہ): از ڈاکٹر شبیر بہادر خاں تنجی۔ مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت، افکار اور خدمات کے بارے میں مطالعہ اور تاثرات۔ صفحات: ۲۲، قیمت: ۲۵ روپے (مجلد)

امام الہند مولانا آزاد: از مولانا امداد صابری۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے قلم سے مقدمہ۔

صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۶۵ روپے (مجلد)

اردو کا ادیبِ اعظم: مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین، تقاریر، شذرات، تبصرے اور دونوں بزرگوں کے مابین مراسلت کا مجموعہ۔ صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۳۰ روپے (مجلد)

خطوطِ ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی کے علمی، ادبی، لسانی اور نجی حالات میں تقریباً تین سو خطوط اور مختلف مشاہیرِ علم و ادب کے بارے میں تیس پیغامات کا مجموعہ۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے قلم سے مقدمہ۔

صفحات: ۲۷۲ قیمت: ۶۰ روپے (مجلد)

ابوالکلام آزاد: مولانا آزاد پر چھپنے والا پہلا مجموعۂ مضامین جو پہلے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اِسے مولانا آزاد کے ایک صاحبِ ذوق معتقد عبداللہ بٹ مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ اب آزاد صدی ایڈیشن، مرتب مرحوم کے حالات اور مرحوم کے نام مولانا آزاد کے خطوط کے اضافے کے ساتھ صفحات: ۱۵۲، قیمت: ۳۰ روپے (مجلد)

آسپکٹس آف ابوالکلام آزاد (انگریزی) مرتبہ عبداللہ بٹ مرحوم اضافے کے ساتھ عکسی اشاعت۔
صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۴۰ روپے (مجلد)

مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت، سیرت اور کارنامے): مولانا سعید احمد اکبرآبادی

صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۳۰ روپے (مجلد)

ابوالکلام و عبدالماجد (ادبی معرکہ): از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری - الہلال کی ایک ادبی، لسانی بحث کی مفصل روداد۔ صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

ابوالکلام آزاد — ایک مطالعہ: مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کی علمی و عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر پاکستان اور ہندوستان کے مشہور اہل علم اور اصحاب قلم کی نگارشات کا بہترین مجموعہ
صفحات: ۲۴۸، قیمت: ۵۰/- روپے (مجلد)

انجمن خدام کعبہ (تاریخ قیام اور مقاصد و خدمات): از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری۔
صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۳۰ روپے (مجلد)

اردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام کا حصہ: از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری۔
صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۴۰ روپے (مجلد)

پیغام، کلکتہ: مرکزی خلافت کمیٹی کا ترجمان، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں شائع ہونے والا تاریخی ہفت روزہ۔
تعارف از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری۔ عکسی اشاعت، صفحات: ۱۹۲+۱۶، قیمت: ۱۰۰/- روپے (مجلد)

مولانا حسرت موہانی: مجاہد آزادی کامل: از پروفیسر شفقت رضوی۔ ملک کی مکمل آزادی کے لیے مولانا حسرت کی معرکہ آرا تاریخی مجاہدانہ سرگزشت۔ مسلم لیگ کے اجلاس احمد آباد ۱۹۲۱ء کے نادر تاریخی خطبہ صدارت کے عکس کے ساتھ۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۴۰/- روپے (مجلد)

میر کارواں مولانا ابوالکلام آزاد: از ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شیروانی۔ مولانا آزاد کی زندگی، سیرت اور افکار کے مختلف پہلوؤں پر منتخب مقالات کا مجموعہ۔ صفحات ۱۴۴، قیمت: ۴۰ روپے (مجلد)

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی: ایک سیاسی مطالعہ۔ از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری۔ شیخ الہندؒ کے سیاسی افکار و خدمات پر ہندوستان اور پاکستان میں پہلا علمی و تحقیقی کام اور حضرت کے افادات کا پہلا دستاویزی مجموعہ صفحات ۱۶۸، قیمت ۴۵ روپے (مجلد)

آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان

علی گڑھ کالونی کراچی

(تصحیح و اضافہ شدہ ایڈیشن)

افاداتِ آزاد

مذہبی اور ادبی استفسارات کے جوابات

مولانا ابوالکلام آزاد

کے قلم سے اور اُن کی جانب سے

مولانا کے علمی تبحر، دینی بصیرت، مجتہدانہ نظر اور تفقہ فی الدین کے شاہکار ملفوظات و جوابات

حصۂ اوّل (دینی)

ایمان و عقائد، عبادات، نکاح و طلاق، قرآن و حدیث، فقہ، مسائلِ جدیدہ، تصوف، تعلیم و اصلاح، رسوم، قادیانیت وغیرہ عنوانات کے ذیل میں سینکڑوں مسائل کے متعلق محققانہ، فکر انگیز اور ایمان پرور ملفوظات و جوابات

حصۂ دوم (ادبی)

ادب، تاریخ، فلسفہ، تہذیب، ثقافت اور بہت سے مسائل و افکار اور شخصیات و موضوعات کے بارے میں مولانا آزاد کے تین سو سے زیادہ نہایت معلومات افزا اور بصیرت افروز جوابات

مولانا ابوالکلام آزاد کے نادر افادات کا یہ مجموعہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے ذوقِ تحقیق کا نتیجہ اور حسنِ ترتیب و تدوین کا نمونہ ہے

اس مجموعۂ افادات کی تصحیح مولانا غلام رسول مہر نے فرمائی ہے

اور

اس پر ایک عالمانہ و ادیبانہ مقدمہ مولانا آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں کے قلم سے!

سفید کاغذ ——— آفسٹ کی چھپائی ——— قیمت ۲ روپے